سباحۃ الفکر فی الجہر بالذکر

کیا بلند آواز سے ذکر منع ہے؟

تصنیف: علامہ عبدالحیّ لکھنوی

ترجمہ: پروفیسر سیّد ذاکر حسین سیالوی

اسلامیہ لاہور

میہ پارک لاہور فون: 7594003

(اردو مع عربی)

کیا بلند آواز سے ذکر منع ہے؟

تصنیف

علامہ محمد عبد الحی لکھنوی رح المتوفی ۱۳۰۴ھ

ترجمہ

پروفیسر سید محمد ذاکر حسین سیالکوٹی

نام کتاب: سباحۃ الفکر فی الجہر بالذکر

تصنیف: علامہ محمد عبد الحیی لکھنویؒ

نام ترجمہ: کیا بلند آواز سے ذکر منع ہے؟

مترجم: پروفیسر سید محمد ذاکر حسین سیالوی
بانی جامعۃ الزہرا اہل سنت راولپنڈی

خطاط: سید قمر الحسن ضیغم قادری

ناشر: عالمی دعوت اسلامیہ
۱۔ فصیح روڈ، اسلامیہ پارک لاہور

پروف ریڈنگ: حافظ ابوسفیان نقشبندی

طابع: سہیل لطیف

تعداد: ۱۱۰۰

اشاعت اول: جون ۱۹۹۶ء

انتساب

مخدومِ اہلِ سنّت، پیرِ طریقت، ضیغمِ ولایت

ابوالخیر محمد عبداللہ جان مجّددی دامت برکاتہم العالیہ

مُرشد آباد شریف پشاور کے نام جو محافلِ ذکر و فکر

خُوب گرماتے ہیں۔ اس لیے اس ترجمہ کا

انتساب انہی کو جچتا ہے

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

سید محمد ذاکر حسین سیالوی

الباھر فی حکم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالباطن والظاھر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی

ظاہر و باطن پر

تصنیف

امام جلال الدین سیوطی

ترجمہ

علامہ محمد اکبر علی خان قادری

عالمی دعوتِ اسلامیہ

۱۔ فصیح روڈ اسلامیہ پارک لاہور فون: ۷۵۹۴۰۰۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مفتی محمد خان قادری

آج ہمارا معاشرہ نیکی، تقویٰ اور خوفِ خدا سے عاری دکھائی ہوتا جارہا ہے۔ اس میں عریانی، فحاشی اور بے راہ روی نے اپنی جڑیں پختہ کرنی شروع کر دی ہیں۔ ہر طرف اسلام کی تعلیمات اور احکام شریعت کو بے وقعت بنانے کے لیے شیطانی قوتیں برسرپیکار ہیں۔ مادیت اور دنیا کی زیب و زینت نے بندوں کا اپنے اللہ اور رسول سے تعلق نہایت کمزور کر دیا ہے۔ اب حال یہ ہو چکا ہے کہ کچھ لوگ معاذاللہ یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ انہیں جو مزا گانے میں آتا ہے نماز میں نہیں آتا۔ نماز میں مزا کیسے آسکتا ہے؟ جب دل و دماغ شیطنت سے زہر آلود ہوں۔ ہمارے خالق و مالک نے اعلان کر رکھا ہے۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۔

جو شخص رحمٰن کے ذکر سے منہ موڑے اس پر ہم شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں وہی اس کا ساتھی اور یار ہوتا ہے۔

دوسرے مقام پر رب و رسول سے تعلق توڑنے والوں کی حالت یوں بیان فرمائی:

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا۔

کیا وہ بندہ جس کے لیے اس کے برے اعمال خوبصورت و مزین کیے جاتے ہیں تو وہ اسے اچھا دیکھتا ہے

ہم اعتراف کریں یا نہ کریں ہماری حالت یہی ہو چکی ہے۔ الا ماشاء اللہ!

حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے اس بات کو یوں بیان کیا:

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

ان زہر آلود، زنگ زدہ اور بیمار دلوں کا علاج فقط اللہ اور اس کے رسول کا ذکر ہے۔ جب تک ہم دلوں کو ذکرِ الٰہی اور یادِ رسول کی بہار سے آشنا نہیں کرتے ان پہ خزاں کا ہی تسلط اور قبضہ رہے گا۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب سنو، ذکرِ الٰہی ہی سے دلوں کو سکون و اطمینان میسّر آسکتا ہے۔

نہایت ہی صاحبِ بخت و کمال ہیں وہ اہلِ علم و صفا جو اس گلستاں کی مہک سے خود بھی معطر ہیں اور دوسروں کو بھی معطر کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں

چاہیئے تو یہ تھا کہ امت متحد ہو کر معاشرے کی بے راہ روی کے خلاف جہاد کرتی، افرادِ امت کو محبت و پیار سے بھولا ہوا سبق یاد دلا کر اسے اس کی منزل کی طرف گامزن کرتی مگر افسوس صد افسوس حال یہ ہو گیا ہے کہ اب برائیوں کے خلاف جہاد تو کجا ہم اچھائیوں کے معاملے میں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں اور اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو غیر ضروری اور بے فائدہ مصروفیات میں ضائع کر رہے ہیں۔ اس طرف تو ذہن متوجہ ہیں کہ فلاں وقت ذکرِ الٰہی اور درود شریف بلند آواز سے نہ پڑھا جائے کہ نیند و آرام میں خلل واقع ہوتا ہے مگر کسی علاقے یا محلہ سے یہ آواز بلند نہیں ہوتی کہ فحش گانے اور عریانی و فحاشی کو بند کیا جائے۔

رہا مذہبی طبقہ تو وہ بھی آپس میں انہی مسائل میں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ ذکر آہستہ ہونا چاہیئے یا بلند آواز سے۔ اس وقت کلمہ طیبہ پڑھا جائے یا نہیں۔ فلاں وقت درود

شریف کا ورد کیا جائے یا نہیں ؛ حالانکہ ہم اتنا ہی سوچ لیں کہ ذکر کرنے والا اپنے خالق و مالک کا ہی نام لے رہا ہے ، درود شریف پڑھنے والا اللہ کے حبیب کو ہی یاد کر رہا ہے ۔ وہ کسی بُرائی کا ارتکاب تو نہیں کر رہا۔

یہاں ہم امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک عمل ذکر کرتے ہیں جس کے مطالعہ کے بعد ہر کوئی اپنے گریباں میں جھانک کر جائزہ لے کہ ضد بازی میں ہم کہاں پہنچ چکے ہیں ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دوستوں کے ساتھ نمازِ عید پڑھانے کے لیے عید گاہ میں تشریف فرما تھے ۔ ایک آدمی نے نماز عید سے پہلے نوافل ادا کرنے شروع کر دیئے ۔ آپ نے اسے منع فرمایا ۔ دوسرے لوگ بھی خاموش رہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہمارا بولنا ہرگز مناسب نہیں ۔ نمازِ عید کے بعد دوستوں نے عرض کیا ۔ کیا وجہ آپ نے اسے نوافل ادا کرنے سے منع نہیں فرمایا ۔ حالانکہ عید گاہ میں نماز عید سے پہلے اور اس کے بعد نوافل ادا نہیں کیے جا سکتے ۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ۔ یہ بات میرے علم میں تھی مگر معاملہ یہ ہوا کہ جب میں اسے منع کرنے لگا تو مجھے قرآن کریم کی یہ آیات یاد آ گئیں ۔

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا   کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا

إِذَا صَلَّىٰ ۔   جو بندے کو نماز سے روکتا ہے ۔

تو میں نے سوچا اگر میں اس شخص کو نوافل سے روکتا ہوں تو کہیں نماز سے روکنے والوں میں میرا نام نہ آ جائے ۔ اس لیے میں خاموش رہا ۔

اگر ہمارے دل محبتِ الٰہی سے معمور ہوتے تو ہم کبھی بھی ذکرِ الٰہی اور یادِ رسول کے خلاف فتویٰ بازی نہ کرتے اور اگر کسی جگہ افراط و تفریط ہو تو بڑے تدبر اور حکمت کے ساتھ راہِ اعتدال پر لانے کی کوشش

ہندوستان کی سرزمین پر ذکر بالجہر اور بزرگوں کے دوسرے معمولات پر جب کچھ لوگوں کی طرف سے "بدعت" کے فتوے جاری ہوئے تو علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کا سختی سے نوٹس لیا۔ اور اس موضوع پر دو کتابیں تصنیف کیں:

۱۔ سباحۃ الفکر فی الجہر بالذکر (ذکر بالجہر کا جواز)

۲۔ اقامۃ الحجۃ علی ان الاکثار فی التعبد لیس ببدعۃ۔ (عبادت میں کثرت بدعت نہیں)

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیق کے ساتھ دمشق سے دونوں کتب بڑی آب و تاب سے شائع ہو چکی ہیں۔

ضرورت تھی اس بات کی کہ ان مفید کتب کو اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے تاکہ عربی نہ جاننے والے لوگ بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔

اس سلسلہ میں مخدوم اہل سنت حضرت پیر عبداللہ جان مجددی دامت برکاتہم العالیہ کی بڑی خواہش تھی کہ یہ کام جلد از جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ انہوں نے اپنی عظیم لائبریری سے "سباحۃ الفکر" کا ایک نسخہ ترجمہ کے لیے بندہ کو بھجوایا۔ میں نے ایک دوست کے ذمے یہ کام لگایا مگر وہ نہ کر سکے

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پروفیسر سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی بانی جامعۃ الزہراء اہل سنت راولپنڈی کو جنہوں نے ہماری خواہش کی جلد تکمیل کر دی۔

بحمد اللہ ترجمہ بہت خوبصورت ہے۔ قارئین دوران مطالعہ ترجمہ کو اصل کتاب محسوس کریں گے۔ پروفیسر صاحب نے سابق مفتی مکۃ المکرمہ شیخ محمد صالح کمال حنفی کے رسالہ "القول المختصر فی بیان الاسقاط" کا بھی اردو ترجمہ "حیلہ اسقاط کی شرعی حیثیت" کے نام سے کیا ہے جسے آستانہ عالیہ مرشد آباد پشاور نے شائع کیا۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ قبلہ پیر صاحب اور محترم پروفیسر صاحب مدظلہما کو دینِ متین کی خدمت کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ بتوفیق اللہ ترجمہ کے ساتھ عربی متن مع حاشیہ عبدالفتاح ابوغدہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

یاد رہے اس موضوع پر امام جلال الدین سیوطی کے رسالہ "نتیجۃ الفکر فی الجہر بالذکر" کا ترجمہ علامہ فضل حنان سعیدی استاذ جامعہ اسلامیہ لاہور کر لیا ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز

خادمِ اسلام

محمد خان قادری

۱۰ اپریل ۱۹۹۶ء بروز بدھ بوقت ۱۲ بجے دن

بمقام جامعہ اسلامیہ لاہور

مرکز تحقیقات اسلامیہ

۲۰۵ر شادمان لاہور، فون ۷۵۸۰۰۰۴

نحمدہ ونسبحہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ہمارا وجود کسی کے لطف و کرم کا صدقہ ہے۔ اگر اس ذات پاک کی عنایات ایک لمحہ بھر ہمارا ساتھ چھوڑ دیں تو ہم عدم محض بن جائیں گے۔ اگر اس کے الطاف کریمانہ ایک لحظہ کے لیے التفات نہ فرمائیں تو ہم دائمی فضا کی وسعتوں میں یوں کھو جائیں کہ وجود کا کوئی کنارہ بھی ہمیں کبھی نصیب نہ ہو۔ جب ہم اس کی ذات اقدس کے اتنے محتاج ہیں تو پھر ہمیں زندگی بھر لپک لپک کر تڑپ تڑپ کر اسی کی طرف بڑھنا ہو گا۔ یہی تڑپ ہمارے وجود کا ثبوت ہو گی اور یہی بے قراری ہماری زندگی کی بہار ہو گی۔ اسی تڑپ اور بے قراری کا نام اصطلاح میں "ذکر" ہے۔

دوسرے لفظوں میں ذکر اس لگن کا نام ہے جو اپنے خالق سے رابطہ کے لیے ہمارے دلوں میں انگڑائیاں لیتی ہے اور ہمارے خیالات' نظریات' معتقدات اور جذبات پر چھا جاتی ہے۔ اسی کو ہم کبھی مودت کہہ دیتے ہیں اور کبھی اسے محبت کا نام دیتے ہیں اور کبھی عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک حقیقت کئی رنگ دھار لیتی ہے۔

جس نے اس رشتے کو بنا لیا' وہ بن گیا اور جو اس رابطے کو توڑ بیٹھا' وہ رہ گیا۔ چونکہ اس تعلق کا خمیر ہمارے وجود میں شامل تھا اور اس شراب طہور کا نشہ ہی مدار حیات تھا' لہٰذا قرآن حکیم اور سنت کریم نے ہماری بہتری کے لیے اس پر بے حد زور دیا۔ رحمت عالم' رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ایسا کر کے امت کو گلشن ذکر کی رعنائیوں کا راستہ دکھا دیا اور بفضلہ تعالیٰ امت آج اسی شاہرہ پر رواں دواں ہے۔

آئیے قرآن و سنت سے صرف چند ذکری احکام پڑھتے چلیں تاکہ ذکر کی اہمیت واضح ہو جائے۔

۱- فاذ کرونی اذ کرکم واشکروا لی ولاتکفرون

"تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد فرماؤں گا اور میرا تم شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو"۔(البقرۃ ۱۵۲)

۲- واذ کرربک کثیرا وسبح بالعشی والابکار

"اپنے پروردگار کا کثرت سے ذکر کیجیے اور صبح وشام تسبیح پڑھا کیجیے"۔

۳- الذین یذ کرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض

"وہ جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں"۔(آل عمران ۱۹۱)

۴- ولذ کراللہ اکبر

"اور یقیناً اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے"۔ (عنکبوت ۴۵)

۵- یاایھا الذین امنوا اذ کروا اللہ ذکرا کثیرا

"اے ایماندارو! اللہ کا بڑی کثرت سے ذکر کرو"۔(احزاب ۴۱)

۶- ویدعوننا رغبا ورھبا

"اور (وہ نبی) ہمیں رغبت میں اور خوف میں پکارا کرتے تھے"۔(الانبیاء ۹۰)

۷- واذ کر اسم ربک وتبتل الیه تبتیلا

"اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کیجیے اور سب سے کٹ کر اسی کا ہو رہیے"۔(مزمل ۸)

آیئے ارشادات ربانی کے بعد فرمودات مصطفوی پر بھی نگاہ ڈالے چلیں۔ ہم نے اختصار کی خاطر طویل احادیث کے صرف وہ فقرے نقل کیے ہیں جو اصل موضوع کے متعلق ہیں۔

۱- فان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منھم

"اگر وہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میرا ذکر مجمع میں کرتا ہے تو اس کے مجمع سے بہتر مجمع میں اس کا ذکر کرتا ہوں"۔(بخاری ومسلم)

۲- فاخبرنی بشئی استن به قال لا لسانک رطبا من ذکر الله

"حضور مجھے کوئی ایسی شئی ارشاد فرمائیں جسے میں دستور العمل بناؤں۔ فرمایا تیری زبان سدا اللہ کے ذکر سے تر رہے"۔ (ترمذی، ابن ماجہ، احمد)

ابو نعیم کے ہاں الفاظ یوں ہیں جب دنیا چھوڑنے لگو تو تمہاری زبان ذکر خداوندی سے تر ہو۔

۳- سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم ای العباد فضل درجه عند الله یوم القیامه قال الذکرون الله کثیرا

"سرکار علیہ السلام سے پوچھا گیا اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے دن کن لوگوں کا درجہ سب سے افضل ہوگا سرکار کریم نے فرمایا ان کا درجہ سب سے بلند ہوگا جو اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں"۔ (احمد، ترمذی، بیہقی)

۴- ولکن اتانی جبرئیل فاخبرنی ان الله یباهی بکم الملائکه

"لیکن میرے پاس جبرئیل آئے اور بتایا کہ اللہ کریم تم (ذکر کرنے والوں) لوگوں کی وجہ سے فرشتوں پر فخر فرماتے ہیں"۔ (مسلم، ترمذی، نسائی، احمد)

۵- ماعمل آدمی عملا انجی له من عذاب القبر من ذکر الله

"اللہ کریم کے ذکر سے بڑھ کر کوئی آدمیوں کا کوئی عمل عذاب قبر سے زیادہ نجات دینے والا نہیں"۔ (مسند احمد، مالک، ترمذی، ابن ماجہ)

۶- قال هم المتحابون فی الله من قبائل شتی وبلاد شتی یجتمعون علی ذکر الله یذکرونه

"(وہ لوگ جن کے چہرے نوری، منبر نوری اور جن پر لوگوں کو بھی رشک ہوگا) سرکار نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی محبت میں مختلف جگہوں اور مختلف قبائل سے آکر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ذکر خداوندی میں مشغول ہوتے ہیں"۔ (طبرانی، الدار

مجمع الزوائد)

۷۔ قال اکثروا ذکر اللہ حتیٰ یقولوا مجنون
"ارشاد ہوا اللہ کا ذکر اس شدت و کثرت سے کرو کہ لوگ تمہیں مجنوں کہنے لگ جائیں"۔(احمد' ابو یعلی' ابن حبان' حاکم)

ان سب آیات اور احادیث میں ذکر کو عام اور مطلق انداز سے بیان فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا ذکر کی سب اقسام اس میں شامل ہیں۔ خواہ وہ ذکر جہری ہو یا خفی ہو۔ قلبی ہو یا عقلی ہو۔ الفاظ ادا ہوں یا سانس ذاکر ہو۔ غرضیکہ ذکر کی جتنی بھی صورتیں علماً اور فکراً بن سکتی ہیں' وہ سب ان آیات اور احادیث سے ثابت ہیں۔

علم اصول کا یہ قاعدہ ہے کہ عام کو بلا دلیل شرعی آپ اپنی طرف سے خاص نہیں کر سکتے اور نہ ہی مطلق کو مقید بنانے کا آپ کو حق ہے۔ جب ہر قسم کا ذکر ان نصوص سے ثابت ہو گیا تو یہ عام ٹھہرا یہ مطلق ہوا۔ اب آپ کہیں کہ نہیں جناب ذکر تو صرف خفی ہوتا ہے تو یہ قید لگا کر مطلق کو مقید کرنے کا آپ کو قطعاً حق حاصل نہیں۔ اسی طرح ذکر کی عمومیت میں ہر قسم کے اذکار شامل ہیں۔ لہٰذا آپ اسے ذکر بالجہر یا ذکر بالقلب سے خاص کریں گے تو لفظ کی عمومیت ٹوٹ جائے گی۔ آپ ایسا کرنے کے ہرگز مجاز نہیں ہیں۔ یہ شریعت کا حق ہے۔ کتاب و سنت کا حق ہے۔ اللہ کریم اور اس کے رسول رحیم علیہ التسلیم کا حق ہے کہ وہ عام سے کچھ خاص فرمائیں یا مطلق کے ساتھ کوئی قید لگا لیں مگر مطلق اور عام اس قید کے علاوہ پھر بھی باقی سب جگہوں پر مطلق اور عام ہی رہے گا۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ حاکم وقت کہہ دے کہ فلاں شہر کے سب لوگوں کو حاضر کیا جائے۔ اب یہ حکم عام سے مطلق ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ حمید' رشید اور ماجد بے شک نہ آئیں' یہ کہنے کا حق آپ کو نہیں ہے۔ ہاں اگر حاکم خود کہہ دے کہ یہ تین آدمی نہ آئیں تو اسے حق ہے مگر ان تینوں آدمیوں کو حکم عام سے خاص کر لینے کے بعد بھی حکم تو عام ہی رہے گا اور باقی سب لوگوں نے لازماً آنا ہو گا۔ حکم کا اطلاق اور عمومیت باقی رہے گی۔

اب آپ مندرجہ بالا آیات و احادیث پر نگاہ ڈالیں۔ ان میں حکم عام ہے' مطلق ہے۔ لہٰذا ذکر جہری بھی مباح اور جائز ہو گا اور ذکر خفی بھی' ذکر قلبی بھی درست ہو گا اور ذکر جوارحی بھی۔ کسی متبع شریعت کا یہ ہرگز حق نہیں کہ اس عام کو اپنی طرف سے خاص کرتا

پھرے یا اس مطلق کے ساتھ اپنی من پسند قیدیں لگا کر اسے مقید کرتا رہے۔ ہاں اللہ کریم اور رسول رحیم چاہیں تو عام کے کچھ اجزاء کو خاص فرمادیں یا مطلق کے کچھ حصے کو مقید فرما دیں۔

اس قاعدے کو ذہن میں رکھیں۔ اب جہاں اللہ کریم یا رسول رحیم علیہ التسلیم نے ذکر خفی کا حکم فرمایا ہے' وہاں ذکر خفی بہتر ہو گا مگر ذکر کی عمومیت کے پیش نظر باقی سب مقامات پر جہر و خفا جائز' مستحسن اور مباح ہو گا۔ جن مقامات پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر جہری کا حکم فرمایا ہے' وہاں جہر افضل ہو گا مگر ان جگہوں کے علاوہ باقی سب مقامات پر حکم مطلق ہی رہے گا کہ چاہو تو بالجہر کرو اور چاہو تو ذکر خفی کرو۔

جو آیات اور احادیث ذکر خفی کی فضیلت میں علمائے کرام نے نقل فرمائی ہیں وہ سب حق ہیں مگر ان سے جہری ذکر کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ وہ مقامات ہیں جنہیں خاص کر کے خفا کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر ذکر کی عمومیت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ان مقامات پر ذکر خفی کیوں ہے؟ اس کا جواب علامہ عبدالحئی صاحب مرحوم نے دیا ہے۔ لہٰذا اسے ذکر کرنے کی یہاں ضرورت نہیں اور جہاں ذکر بالجہر کے مقامات ہیں' ان کی تعیین اگر شریعت نے فرمادی ہے تو اس سے ذکر خفی کی نفی نہیں ہوتی بلکہ وہ مطلق و عام ہی رہتا ہے۔ ہاں ذکر جہر میں اتنے محاسن اور خوبیاں ہیں کہ وہ ذکر خفی میں نہیں ہیں لہٰذا ذکر جہر ان مقامات کے علاوہ جہاں شریعت نے ذکر خفی کا حکم دیا ہے' افضل ہو گا۔ ان فوائد کی طرف مولانا عبدالحئی نے خود بھی اشارے فرمائے ہیں اور کئی جگہ وضاحتیں بھی کی ہیں۔

اس موضوع پر بے شمار لوگ بڑی بڑی حسین تحریریں' یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہم نے ایک قاعدے کے ذریعے جس طرح ان سب آراء کو یک جا کرتے ہوئے تناقض و تخالف کو دور کرنے کے لیے تطبیق کی جو صورت پیش کی ہے' یقیناً علمائے حق اور صلحائے ملت اسے نظر استحسان سے دیکھیں گے۔ اولیاء امت ملت کا محسن ہیں' وہ امت کی روح ہیں۔ اگر ان کا عمل صالح ہی بدعت و حرام پائے تو اس فتوے سے کسی مضطرب جان کو قرار نہیں ملے گا۔

کائنات میں فحش گیت بکھرے پڑے ہیں۔ بدی پوری قوت سے اپنی آواز کو ریڈیو اور ٹی وی پر نکھار رہی ہے۔ محافل و مجالس کی ساری رونقیں بلند آواز سے وابستہ ہیں۔ کیا

اس بدی کو نیکی کی بلند آواز سے روکنا ضروری نہیں۔ ہر وقت بدی کی بلند آواز سن سن کر سن ہوتے ہیں تو اس کی بندش کی کوئی تدبیر نہ ہو اور کسی ذاکر حق کی محفل سے کلمہ طیبہ، درود شریف اور اللہ ھو کی آواز بلند ہو تو لٹھ لے کر بدعت و حرام کے فتووں کی آڑ میں اسے روکنے کی کوشش میں رات دن ایک کر دیے جائیں اور خود اسے بلند آواز ہی سے روکا جائے تو یہ دین اور اسلام کی کون سی خدمت ہوگی؟

ہم تو ایک کلیہ قاعدہ سے ساری بات واضح کر چکے ہیں مگر ایک اور انداز سے بھی اس پر غور کیا جا سکتا ہے اور اکثر علماء نے اس کی طرف اشارے بھی فرمائے ہیں۔ انسانی طبیعتیں متنوع ہیں۔ کوئی فطرتاً خاموشی کو پسند کرتا ہے تو کوئی جبلۃً "بلند آواز کا رسیا ہوتا ہے۔ کسی کا دل خلوت کا دلدادہ ہے تو کسی کا ذہن جلوت کا عاشق ہے۔

شریعت محمدیہ نے سب کا خیال رکھا ہے۔ لہٰذا خاموشی پسندوں کے لیے ذکر خفی تریاق ہے تو جلوت و جہر کے چاہنے والوں کے لیے ذکر جہر معراج روح ہے۔ جہر والے کا حق نہیں کہ کسی کے خفا میں مداخلت کرے اور خفا والے کا حق نہیں کہ جہر والے پر تشنیع و ملامت کے تیر برسائے اور وہ جو جہر و خفا سے نکل کر اس طبع کا ذکر کر رہا ہے کہ فرشتے بھی اس کے عمل کو نہیں سمجھ رہے ہیں اس پر جہر و خفی والوں کو بھلا اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟

کل حزب بما لدیھم فرحون پر ہی تو عمل ہو رہا ہے۔ ہم آخر میں قارئین سے درخواست کریں گے کہ اگر ذوق ...... کی تسکین کرنی ہے تو مندرجہ ذیل کتب کا بھی مطالعہ فرما لیا جائے۔

نتیجۃ الفکر	امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ
الوابل الصیب	علامہ ابن قیم
فضائل ذکر	علامہ محمد زکریا
ذکر بالجہر	مولانا علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی
	یہ کتاب اپنے موضوع پر بے مثل
ذکر الٰہی	کے-بی نسیم
تجویز الرحمان	حضرت خواجہ عبدالرحمن عیدگاہ، راولپنڈی

کچھ مصنف کے بارے میں

برصغیر کے افق پر بے شمار علمی ستاروں کا طلوع ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلامیان برصغیر کے ایمان و عمل کو منور و معطر فرمایا۔ یہاں ہندو پوری تاریخ میں غالب ترین اکثریت میں تھے اور اپنی قدیم عادت کے مطابق ہر اقلیت کو نگل جاتے تھے۔

مسلمانوں کے بارے میں بھی ان کی سوچ یہی تھی کہ بدیر یا بسویر ہندو کا تیز ہاضمہ انہیں بھی کھا ہی جائے گا مگر یہ "اقلیت" ہر صدی میں بڑھتی چلی گئی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

ہم سمجھتے ہیں سب سے بڑی وجہ ہمارے اولیاء و علماء کے وہ افکار تھے، جن سے یہ ملت صاحب نظر ہو گئی تھی۔ وہ عقیدے اور عمل کا کوہ گراں بن گئی تھی، جسے راستے سے ہٹانا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

قرآن و سنت کے انوار کو علمائے عالی وقار نے برصغیر کے چپے چپے پر یوں پھیلایا کہ کوئی بھی متلاشی حق محروم نہ رہا۔ یہ سلسلہ اسی وقت شروع ہو گیا جب مسلمان برصغیر میں آئے اور آج تک مسلسل چل رہا ہے۔

مسلمان اقتدار میں تھے تب بھی علوم اسلامیہ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جب وہ محکوم ہو گئے تب بھی یہ سمندر موجزن رہا۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ محکومی اور غلامی کے دور میں برصغیر میں ایسے ماہرین علم پیدا ہوئے جن کی عظمت کا سکہ پورے عالم اسلام میں چلتا رہا۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی، امام طریقت حضرت مجدد الف ثانی، علامہ محقق عبدالحکیم سیالکوٹی، امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ اور ہمارے مصنف علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ علیہم ایسے ہی صنادید علم و حکمت تھے۔ آیئے حضرت علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ

۔ کے کچھ حالات اور علمی کمالات جاننے کی کوشش کریں۔

ولادت

آپ باندا میں ۱۲۶۴ اس عالم رنگ وبو میں جلوہ افروز ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد
ملک کے مایہ ناز علماء تھے۔ آپ کے والد گرامی علامہ عبد الحلیم کئی علمی اور نئی کتابوں کے
مصنف ہیں اور برصغیر کے علماء و طلباء آپ کی علمی عظمت کے معترف ہیں اور ان کی کتابوں
سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔

شجرۂ نسب

آپ کا شجرۂ نسب یہ ہے۔ علامہ عبد الحیٔ بن عبد الحلیم، بن امین اللہ بن محمد اکبر بن
ابی الرحیم بن محمد یعقوب بن عبد العزیز بن محمد سعید بن شیخ شہید قطب الدین انصاری سہالوی
لکھنوی رحمہ اللہ علیہم۔

تعلیم

سب سے پہلے قرآن پاک یاد کیا۔ پھر اپنے والد (عبد الحلیم) کے پاس معقول و منقول
کی کتب پڑھیں۔ علم ہیئت کی کچھ کتابیں اپنے والد محترم کے ماموں مفتی نعمت اللہ بن نو
اللہ لکھنوی سے پڑھیں۔ ابھی عمر کا سترواں سال جارہا تھا کہ سب علوم متداولہ سے فار
ہوگئے۔

تدریس

ایک عرصہ تک حیدر آباد دکن میں مسند تدریس کو زینت بخشی۔ حیدر آباد کے د
سے اجازت لی اور اپنے شہر لکھنؤ میں مسند تدریس بچھائی۔ لوگوں نے آپ سے ب
استفادہ کیا اور یہیں آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں اور وعظ و ذکر کی محا
سجائیں۔ پوری عمر یہیں بسر فرمادی۔ یہاں آپ کی تنخواہ صرف اڑھائی سو روپے تھے۔
غیور نے اسے کافی سمجھا۔

حج

آپ نے اپنی زندگی میں دو حج کیے۔ پہلی دفعہ والد گرامی کے ساتھ ۱۲۷۷ھ میں یہ مقدس سفر اختیار کیا اور دوبارہ والد محترم کے وصال کے بعد ۱۲۹۳ھ میں شرف حضوری سے لطف اندوز ہوئے۔

سند حدیث کی اجازت

اس مقدس سفر میں عظیم شافعی عالم و ولی حضرت علامہ سید احمد بن زین دحلان مکی نے آپ کو اجازت سے نوازا۔ حنبلی عالم و عارف حضرت علامہ مفتی محمد بن عبداللہ بن حمید نے بھی سند و اجازت سے نوازا۔ یہ دونوں اصحاب علم و فکر حرم مکہ میں مسند درس و ارشاد بچھائے بیٹھے تھے۔ حرم نبوی میں پہنچے تو حضرت شیخ محمد بن محمد عربی شافعی نے اجازت سے نوازا۔ وہاں آپ کی ملاقات حضرت شیخ عبدالغنی بن ابو سعید عمری حنفی دہلوی سے بھی ہوئی۔ انہوں نے بھی آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر اجازت سے نوازا۔ تینوں فقہی و علمی سلاسل، حنفی، شافعی، حنبلی سے دونوں حرموں میں آپ کو اجازت مل گئی۔ اس دور میں دنیا بھر کے علماء جب حج کے لیے جاتے تھے تو وہاں کے علمی مراجع کو اپنے تعلیمی و تدریسی مقام سے آگاہ کر کے ان سے علمی اسناد لیتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی بھی ایسی اسناد لینے والوں میں شامل ہیں۔

فن مناظرہ

آپ کے تحریری علمی مناظرے بھی مختلف حضرات سے ہوتے رہے۔ علامہ عبدالحق بن علامہ فضل حق خیر آبادی، علامہ محمد بشیر اور سید صدیق حسن حسینی قنوجی سے بڑے علمی تحریری معرکے رہے۔ علامی صدیق حسن سے مناظرے میں شدت کی آخری حدیں آگئیں جن کو فطرت سلیمہ پسند نہیں کرتی مگر جب آپ کا وصال ہوا تو علامہ صدیق

حسن نے بے حد تاثر لیا۔ اس رات کھانا نہیں کھایا اور آپ کی غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھی۔ یہ سب کچھ آپ کی علمی و فکری عظمت کی دلیل تھی۔

فقہی مسلک

آپ اصول و فروع میں امام اعظم کے مقلد تھے مگر متعصب نہیں تھے۔ اگر نص صریح مسلک کے خلاف مل جاتی تو اسے مانتے اور مسلک کی بات چھوڑ دیتے۔ اس سلسلہ میں اپنی کتاب "النافع الکبیر" میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

"اللہ کریم کا ایک احسان مجھ پر یہ بھی ہے کہ مجھے فن حدیث اور فقہ حدیث پر بھرپور توجہ بڑی وسعت سے عطا فرمائی گئی ہے۔ میں جب تک کسی آیت یا حدیث سے مسئلہ کا اصل معلوم نہ کرلوں تو اس پر اعتماد نہیں کرتا۔ جو بات بھی صریح اور صحیح حدیث کے خلاف ہو' میں اسے چھوڑ دیتا ہوں اور مجتہد کو اس میں صرف معذور نہیں بلکہ ماجور (جسے اجر و ثواب ملے) سمجھتا ہوں۔ لیکن میں عوام کالانعام کو تشویش میں نہیں ڈالتا۔ ان سے ان کی عقل کے مطابق بات کرتا ہوں"۔ [۱]

کچھ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

۱۔ حضرت علامہ عبدالحئی لکھنوی اور علامہ اقبال کا مسلک حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملتا جلتا ہے۔ حق یہ ہے کہ عوام کے لیے تقلید ناگزیر ہے مگر اہل علم ارباب فکر و نظر کا معاملہ بالکل عوام جیسا نہیں ہے۔ تقلید اور عدم تقلید پر بڑی بحثیں اسلامی لٹریچر میں ملتی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہے "میں سلف کا پیرو ہوں نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں اور عملی اعتبار سے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کا مقلد ہوں' علامہ اقبال کے وصیت نامے کا یہ جملہ "میں سلف کا پیرو ہوں" انتشار فکر اور تجدد و آزاد خیالی کے اس دور میں مشعل راہ ہے۔ عقائد و اعمال میں سلف صالحین کی پیروی میں دین و ایمان کی سلامتی ہے۔ علامہ اقبال مجتہدانہ فکر و نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے علوم کے بحر ذخار میں شناوری کی تھی مگر اس کے باوجود سلف صالحین کی پیروی کے وہ قائل تھے اور یہ دلیل ہے اقبال کی پختگی ایمان اور سلامتی طبع کی) (ماخوذ از روزگار "فقیر" ج ۲' ص ۶۱-۶۲' فقیر سید وحید الدین --- مترجم)

"یہ بھی اللہ کریم کا فضل ہے کہ میں افراط (زیادتی) اور تفریط (کمی و کوتاہی) کے درمیان چلتا ہوں اور جب بھی کوئی معرکۃ الآرا مسئلہ سامنے آتا ہے تو مجھے طریق وسط (درمیانہ راستہ) کا افہام ہو جاتا ہے۔ میں تقلید محض کا قائل نہیں ہوں کہ شرعی دلائل کے ہوتے ہوئے فقہاء کی بات مانوں یا فقہائے کرام کے اقوال کو کلیتہ چھوڑ کر ان پر طعن و تشنیع کے تیر برساتا رہوں"۔

ان کی تحقیق یہ ہے کہ "اگر کسی مسئلے میں قوت دلیل کے پیش نظر اپنے فقہی امام کے خلاف بھی ایک محقق عالم چلا جائے تو پھر بھی اپنے امام کا مقلد ہی رہتا ہے۔ مثال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علامہ عصام بن یوسف نے رفع یدین کے مسئلہ میں سیدنا امام اعظم کے استدلال کو چھوڑ دیا مگر وہ بھی حنفی علماء میں ہی شمار ہوتے ہیں۔ ہمارے معتبر فتاویٰ میں لکھا ہے کہ مسئلہ قلتین (دو مٹکے پانی ہو تو اسے امام شافعی پاک کہتے ہیں۔ حنفی اسے ناپاک کہتے ہیں) ذاکر) میں امام یوسف ایک دن امام شافعی کی تقلید فرمائی مگر دور حاضر کے جہلاء تو طعنہ بازی کے تیر برسانے لگ جاتے ہیں۔ اگر آج کوئی شخص قوت دلیل کی بنا پر کسی ایک مسئلہ میں اپنے امام کی تقلید چھوڑ دے تو وہ اسے امام کا مقلد نہیں کہتے لیکن وہ عوام ہیں لہٰذا یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ حیران کن عمل تو ان لوگوں کا ہے جو علماء کے مشابہ ہیں مگر ان کی چال عوام جیسی ہے"۔ (فوائد بہیہ 'از مولانا عبدالحئی رحمتہ اللہ علیہ)

ایک تبصرہ

"الاعلام" جلد ۸' ص ۲۵۱ پر علامہ عبدالحئی حسینی نے عربی زبان میں آپ کے متعلق جو رائے دی ہے' ہم ملخصا" اس کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"میں آپ کی محفل میں کئی دفعہ حاضر ہوا۔ آپ کا چہرہ سیہ سرا صباحت تھا۔ سیاہ آنکھیں' چیر کر نکلنے والی نگاہ' ہلکے ہلکے رخسار' لمبے بال' ذکی و فطین تیز ذہن' عفیف جان' نرم پہلو' چھا جانے والا خطیب' علوم معقول و منقول کا بحر بے کراں' شریعت کے دقائق و غوامض کا فاضل اجل' علوم کا سمندر' نقل احکام اور تحریر مسائل کا

مشاق، علم فتویٰ میں برصغیر کا گوہر یکتا، جس کا ذکر لے کر سوار چلتے ہیں اور سب صوبوں اور ممالک کے علماء آپ کی عظمت کے معترف ہیں اور وہ سب کے مشار الیہ ہیں۔

انہیں اصول و فروع میں قوت کاملہ، قدرت شاملہ، فضیلت تامہ اور احاطہ عامہ حاصل ہے۔ انہیں حسن تعلیم میں وہ صناعت ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ جب وہ اہل علم کی محفل میں ہوتے اور علمی فنون میں سے کسی فن پر بات چل نکلتی تو آپ بالکل خاموش بیٹھے رہتے اور بہ نظر غائر علماء کو دیکھتے رہتے۔ وہ آخر میں آپ کی طرف رجوع کرتے۔ آپ بڑے جامع انداز سے حل پیش فرماتے جسے سب لوگ مان لیتے اور سامعین اسے کافی سمجھتے۔ سدا ان کا یہی وطیرہ رہا جو بھی معاملہ ہوتا، طیش اور ہلکا پن سے اجتناب فرماتے۔ حاصل کلام اور خلاصۃ المرام یہ ہے نابغہ روزگار اور عجوبہ زمانہ تھے۔ وہ برصغیر کا ایک حسن تھے، آپ کی تعریف پہ پورا ملک متفق تھا اور آپ کی عظمت و فضیلت میں کسی کو کلام نہیں تھا۔ سب مقر تھے"۔

باقی علوم کے ساتھ ساتھ انہیں علم الانساب، تاریخ اور فنون فلسفہ پر کامل دسترس حاصل تھی۔

تصانیف:

آپ نے صرف، نحو، مناظرہ، منطق، فلسفہ، نسب، تاریخ، فقہ، حدیث اور اصول حدیث کے موضوعات پر بقول مصنوف الاعلام ۸۹ کتب تحریر فرمائیں۔ دو کتابوں کا تعلق ذکر سے ہے۔ ایک "سباحۃ الفکر" اور دوسری "نزاحۃ الفکر" ہے۔ کتابوں کی فہرست اعلام نمبر ۸، ص ۲۵۳ تا ۲۵۵ مطبوعہ دار عرفات رائے بریلی (ہندوستان) پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ہم تبرکاً چند کتابوں کے نام قارئین کی نذر کرتے ہیں:

"التعلیق"، علی موطا محمد، "عمدۃ الرعایہ شرح الوقایہ"، "القول الجازم"، "تحفۃ النبلاء"، "الفوائد البہیہ"، "مقدمہ الھدایہ"، "النافع الکبیر"، "خیر العمل"، "مجموعہ

الفتاویٰ" (تین جلدیں)' "الایات البینات"' "الکلام الوجی"' "المعارف"' "التبیان شرح المیزان"' "ھدایہ الوریٰ" اور "کلام المتین" وغیرہ۔

دس علوم پر یہ ۸۹ کتب اسلامی لٹریچر میں شاندار اضافہ ہے۔ جس فن پر بھی لکھا ہے' حق تحقیق ادا کر دیا ہے۔

وفات:

ربیع الاول کا صرف ایک دن باقی تھا کہ ۱۳۰۴ھ میں صرف انتالیس سال کی عمر میں دار بقا میں رونق افروز ہوئے۔ اپنے اسلاف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ہر گروہ اور ہر طبقہ کے لاتعداد لوگوں نے جنازہ میں حاضری دی۔ حاضرین آتے گئے۔ لہٰذا آپ کا جنازہ تین دفعہ پڑھا گیا۔

صرف انتالیس سال کے عرصہ میں آپ نے بہت زیادہ علمی اور فکری کام کیا۔ امت میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں' جنہوں نے اتنی مختصر سی زندگی میں اتنا زیادہ کام کیا ہو۔ مشہور اسلامی فنون پر اتنی جامع کتابیں بھی بہت ہی کم لوگوں نے لکھی ہیں۔ انہیں اسی بنا پر ان کے معاصرین شیخ' عالم کبیر اور علامہ شہیر کہتے ہیں

فقیر سید محمد ذاکر حسین شاہ سیالوی
جامعہ الزہراء' اہلسنت
عثمان غنی کالونی ھریال روڈ
صدر' راولپنڈی
۷-۷-۹۵

سب تعریفیں اس ذات اقدس کے لیے ہیں جس نے ذکر کرنے والوں کے لیے عظیم فضل تیار فرما رکھا ہے اور شکر سارے اس ہستی مقدس کے لیے ہیں جس نے اطاعت شعاروں کے لیے بڑا وعدہ عطا کر رکھا ہے۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اس کے بغیر کوئی قابل عبادت نہیں۔ وہی توبہ قبول فرمانے والا سدا رحم کرنے والا ہے۔

میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد ﷺ اس کے خاص بندے اور خلق عظیم کے مالک رسول ہیں۔ اللہ کریم آپ پر اور آپ کی آل اور اصحابہ پر ایسا درود بھیجے جو ہمیں جنت میں داخل کر دے۔

حمد و صلوۃ کے بعد اپنے قوی رب کریم کی رحمت کا مشاق ابو الحسنات محمد عبد الحئ لکھنوی (اللہ کریم اس کے ظاہری و باطنی گناہ معاف فرمائے کہتا ہے کہ مجھ سے ذکر جہر کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ جائز ہے یا نہیں؟ تو میں نے جواب میں کہا اگر چہ ہمارے اکثر حنفی علماء اس کی کراہت و حرمت کی تصریح کر چکے ہیں لیکن محققین احناف اس کے جواز کے قائل ہیں۔ جب تک یہ جہر حد سے نہ بڑھ جائے' کیونکہ ذکر جہر پر کئی احادیث موجود ہیں' پھر میں نے چاہا کہ اس موضوع پر ایک رسالہ لکھ دوں جس کا نام "سباحتہ الفکر فی الجہر بالذکر" ہو۔ اس میں دو باب ہیں۔ پہلا باب ذکر جہر کا حکم کیا ہے؟ میں اس میں اپنے احناف کے ارشادات نقل کروں گا اور احادیث مرویہ سے حق کو تاباں کروں گا۔ دوسرے باب میں ان جگہوں کی نشاندہی ہوگی' جہاں آئمہ کرام نے ذکر جہر کی تصریح فرمائی ہے۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ اس رسالہ کو اپنے موضوع پر جامع بنائے اور مجھے صدق و صواب کا الہام فرمائے۔

مقدمہ

ہم پہلے ایک مقدمہ لاتے ہیں جس میں ذکر جہراور ذکر خفی کی حد متعین کریں گے اور ان کے متعلق دیگر مسائل بھی مذکور ہوں گے۔

جہر و سر کی حد میں آئمہ کے تین اقوال ہیں۔ لیکن عام کتب احناف میں ، قول مذکور ہیں:

امام کرخی رحمتہ اللہ علیہ کا نظریہ:

پہلا قول امام کرخی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے کہ جہر کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ ذکر کرنے والا صرف اپنی ذات کو سنائے اور ادنیٰ سر یہ ہے کہ حروف صحیح ادا ہوں۔ محیط میں مذکور ہے کہ علامہ ابو بکر اعمش بلخی رحمتہ اللہ نے بھی یہی معنی بیان فرمایا ہے اور کتاب مجتبیٰ میں ذکر ہے کہ امام محمد اور قدوری کا بھی یہی مسلک ہے۔ جامع الرموز میں مسعودی کے حوالے سے منقول ہے کہ یہی معنی ابوالحسن ثوری نے بھی کیا ہے۔ جامع الرموز میں عمادی فرماتے ہیں ابو نصر بن سلام بھی یہی معنی مراد لیتے ہیں۔

"الجوھرۃ النیرہ" میں قدوری کے اس قول (کہ نمازی اگر اکیلا نماز پڑھ رہا ہے تو اسے اختیار ہے کہ جہر کرکے اپنے آپ کو سنائے) کی شرح میں لکھا ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ حد جہر اپنے آپ کو سنانا ہے اور حد سر یہ ہے کہ حروف صحیح ادا ہوں۔ ابوالحسن کرخی کا یہ ارشاد ہے کہ ادنیٰ جہر یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنادے اور اعلیٰ جہر یہ ہے کہ دوسرے کو سنادے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرات زبان کا فعل ہے' کان کا فعل نہیں۔ بدائع میں ہے کہ امام کرخی کا قول ہی سب سے صحیح ہے اور یہی قیاس کے مطابق ہے۔ امام محمد رحمتہ اللہ کی کتاب "الصلوۃ" میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نمازی چاہے تو اپنے جی میں پڑھے اور چاہے تو اونچا پڑھ کر اپنے آپ کو سنائے۔ اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے

بھی حضرت امام کرخیؒ کا قول ہی اختیار فرمایا ہے۔

"ہدایہ" میں ہے امام کرخی فرماتے ہیں ادنیٰ جہر یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنائے اور ادنیٰ سر یہ ہے کہ حروف کی ادائیگی صحیح ہو۔ کیونکہ قرات زبان کا کام ہے' کان کا نہیں۔

"غایتہ البیان" میں ہے کہ کتابت کو قرات کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ اس میں حروف کی ادائیگی بھی صحیح ہو کیونکہ وہاں سرے سے آواز پائی ہی نہیں جاتی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عبارت امام کرخی کے خلاف نہیں جاتی کیونکہ انہوں نے تصحیح حروف کو مطلقاً قرات قرار نہیں دیا۔ بلکہ زبان سے تصحیح حروف کو قرات قرار دیا ہے اور کتابت سے تصحیح حروف تو ہوتی ہے مگر یہ قلم سے ہوتی ہے' زبان سے نہیں اور کہا گیا ہے کہ کلام آواز کے ساتھ زبان کا فعل ہے' حروف کو صرف درست کردینا تو آواز نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں آواز کی قید اس کہنے والے نے ہی لگائی ہے' لہٰذا یہ اس کے غیر اور مخالف کے لیے حجت نہیں۔ لہٰذا وہ اس کو سننا بھی گوارا نہیں کرے گا۔ ہم اس قول کے رد میں کہتے ہیں کلام اس حقیقت کا نام ہے جو گونگا پن اور خاموشی کے خلاف ہے۔ جب حروف کی تصحیح ہوگی تو یہ معنی حاصل ہو جائے گا (یعنی تصحیح حروف سے پتہ چل جائے گا کہ یہ بندہ نہ گونگا ہے اور نہ ہی خاموش ہے۔۔ مترجم) اب آواز کی احتیاج نہیں ہوگی۔

"فتح القدیر" میں ہے کہ مصنف کا یہ فرمانا کہ کتاب کی عبارت میں حضرت کرخی رحمہ اللہ کے قول کی طرف اشارہ ہے' یہ اس بنا پر ہے کہ وہ اپنے آپ کو سنائے کسی اور کو نہیں۔ کیونکہ اعتبار تو لقب و خطاب سے ہے ورنہ اگر مراد صرف ادائیگی حروف سے ہوتی تو بات اچھی نہ ہوتی (یعنی قرات کرنے والا تصحیح حروف سے اپنا مطلب و خطاب بیان کر رہا ہوتا ہے صرف تصحیح حروف مراد نہیں ہوتی۔۔۔ مترجم)

معلوم ہونا چاہیے کہ قرات اگرچہ زبان کا فعل ہے لیکن یہ وہ فعل ہے جسے کلام کہتے ہیں اور کلام حروف کے ذریعہ ہوتی ہے اور حرف وہ کیفیت ہے جو آواز سے پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ آواز کے بغیر اگر حروف کی تصحیح ہو تو وہ صرف مخارج کے عضلات کے ذریعے حروف کی طرف ایما اور اشارہ ہوگا۔ وہ حروف تو نہیں ہوں گے (یہاں تک مذکور بالا سب آئمہ سے بات ثابت ہوئی کہ ادنیٰ جہر اپنے آپ کو اپنی آواز سنانا ہے اور ادنیٰ سر یہ ہے کہ آپ اپنے مطلب کے مطابق حروف صحیح ادا کر رہے ہوں۔ مترجم)

فقیہ ابو جعفر ہندوانی اور امام ابو بکر محمد بن فضل کا نظریہ

دوسرا قول فقیہ ابو جعفر ہندوانی اور امام ابوبکر محمد بن فضل کا ہے کہ جہر میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی اور تک آپ کی آواز پہنچے۔ لہٰذا ادنیٰ جہریہ ہے کہ آپ کی آواز کوئی اور سن رہا ہو۔ خواہ سننے والا ایک ہی ہو اور ادنیٰ سریہ ہے کہ اپنے آپ کو آواز سنائی دے۔ صرف تصحیح حروف نہ ہو۔ یہی بات صحیح ہے۔

"وقایہ" "نقایہ" اور "ملتقی الابحر" "معراج الدرایہ" میں ہے کہ حضرت شیخ الاسلام، علامہ قاضی خان محیط کے مصنف اور علامہ حلوانی نے بھی یہی معنی مراد لیا ہے۔ اسی قول کو "شارحین وقایہ النقایہ" "ملتقی الابحر" "ہدایہ" کے شارحین اور عام مفتیان عظام نے لیا ہے۔ مضمرات میں ہے کہ یہی مذہب مختار ہے۔

صاحب فتاویٰ خیریہ کا نظریہ

• "فتاویٰ خیریہ" میں دونوں نظریات کے مقلدین کی عبارات نقل کرنے کے بعد مصنف فرماتے ہیں میں یہی کہتا ہوں کہ اکثر علماء نے ہندوانی کا قول اختیار کیا ہے۔ لہٰذا "تنویر الابصار" کے متن میں اسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ ہاں قدوری کے کلام سے یہی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے علامہ کرخی کا قول پسند کیا ہے، زیادہ صحیح کیا ہے؟ ہندوانی کا قول زیادہ صحیح اور قابل ترجیح ہے۔ کیونکہ ہمارے اکثر حنفی علماء نے اسی پر اعتماد کیا ہے۔ ہندوانی کے اس قول میں --- کہ ادنیٰ جہر غیر کو سنانا ہے --- علماء کا اختلاف ہے کہ اس سے ہندوانی کیا مراد لیتے ہیں۔

عام علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد قرات کرنے والے کے علاوہ دوسرا شخص ہے، خواہ وہ ایک ہی ہو یا اگر دو سن لیں تو یہ اعلیٰ جہر ہے۔

"صلوۃ مسعودی" میں ہے کہ امام کا جہریہ ہے کہ پہلی صف آواز سن سکے اور "خلاصہ" اور "مجتبیٰ" میں مذکور ہے کہ جہریہ ہے کہ سب مقتدی سن رہے ہوں۔ "جامع الرموز" میں ہے کہ یہ دونوں روایات محل نظر ہیں۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر

مقتدی بہت زیادہ ہوں اور سب تک امام کی آواز نہ جائے تو یہ جہر نہیں بلکہ مخافت ہو گی یعنی (سر)(اور یہ بات کوئی بھی نہیں مانتا--- مترجم)

صاحب نہر الفائق کا نظریہ

ہندوانی کے نزدیک جہر دوسرے کو سنانے کا نام ہے اور خلاصہ یہ ہے کہ اگر اس نے آہستہ پڑھا اور آہستگی کی حد یہ ہے کہ اگر ایک یا دو آدمی سن بھی لیں تو وہ خفی ہے جہری نہیں ہے۔ اگر جہر سے مراد سب حاضرین محفل کو سنانا ہے تو یہ مشکل بات ہے۔

"در مختار" میں ہے کہ مخافت (خفی) اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ والے کو سنانا ہے۔ اگر آواز ایک یا دو آدمی سن لیں تو یہ جہر نہیں ہے"۔

"ردالمختار" میں علامہ ابن العابدین کا ارشاد ہے کہ متن میں جو عبارت آئی ہے کہ قریبی سن لے' یہ ضروری تصریح ہے۔

علامہ قہستانی فرماتے ہیں غیر یا جو اس کے قریب ہے (اس عبارت میں) لفظ سے پہلے او (یا) آیا ہے اور یہ بڑی واضح بات ہے۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ کم سے کم جہر یہ ہے کہ دوسرا سنے جو اس کے قریب نہیں ہے اسی لیے خلاصہ اور خانیہ میں جامع صغیر کے حوالے سے منقول ہے کہ:

"جب امام نے سری نماز میں یوں قرات پڑھی کہ ایک یا دو آدمی سن رہے تھے تو یہ جہر نہیں ہو گا۔ جہر یہ ہے کہ پہلی صف کے سارے لوگ سن لیں۔ سب حاضرین نمازی نہیں کیونکہ قہستانی کی کتاب میں مسعودیہ سے نقل ہے کہ امام کے جہر سے مراد یہ ہے کہ پہلی صف کو آواز سنائی جائے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلاصہ کی عبارت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ یہ ہندوانی کے کلام کے خلاف نہیں بلکہ یہ اس کی تصریح ہے۔ اب آپ کو پتہ چل گیا ہو گا کہ سب سے کم مخافت (خفی) یہ ہے کہ وہ خود سن لے یا اس کے پاس والے ایک یا دو آدمی سن لیں اور ادنیٰ جہر یہ ہے کہ جو اس کے قریب نہیں وہ آواز سن لیں۔ مثلاً پہلی صف کے لوگوں تک اس کی آواز پہنچ جائے اور اعلیٰ جہر کی حد ہی نہیں ہے"۔

"بحرالرائق" میں ہے کہ علامہ ہندوانی کے نزدیک ادنیٰ جہر یہ ہے کہ وہ خود س

سکے۔ مجتبیٰ کتاب میں ان سے نقل کرتے ہوئے یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ اس کی قرات جائز نہیں ہوگی جب تک اس سے متصل اور قریب کو آواز سنائی نہ دے۔ حلوانی" سے نقل کرتے ہوئے صاحب ذخیرہ نے فرمایا کہ یہی صحیح بات ہے مگر یہ چوتھا قول نہیں ہے بلکہ یہ ھندوانی کا ہی دوسرا قول ہے۔[1]

"ذخیرہ" میں لکھا ہے کہ قاضی علاؤ الدین نے "شرح مختلفات" میں فرمایا کہ میرے نزدیک یہ بات صحیح ہے کہ بعض معاملات میں اس کا اپنا سننا کافی ہے اور بعض معاملات میں دوسرے کو سنانا ضروری ہے۔ مثلاً اگر مشتری نے بیع میں اپنا کان بیچنے والے کی طرف جھکا کر اس کی بات سن لی تو یہ سودے کے لیے کافی ہے لیکن اگر بیچنے والے نے اپنی بات خود ہی سنی تو کافی نہیں ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ کسی نے قسم کھائی کہ فلاں سے نہیں بولے گا پھر دور سے اسے بلایا مگر اس نے اس بلانے والے کی آواز نہیں سنی ہے تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی"۔ [2] "کتاب الایمان" میں اس کی وضاحت ہے۔

بشرالمریسی کا نظریہ

تیسرا نظریہ بشیرالمریسی" کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں قرات کے وجود کے لیے ضروری ہے کہ آوز نکلے۔ خواہ یہ آواز اس کے اپنے کان تک نہ پہنچ رہی ہو مگر کسی نہ کسی انداز سے سنی جاسکے۔

"فتح القدیر" میں ہے غالباً ھندوانی کے قول کا بھی یہی مطلب ہے کیونکہ جب آواز موجود ہوئی تو سنی جاسکے گی۔ بشرطیکہ سننے سے کوئی رکاوٹ نہ ہو"۔

صاحب "فتح القدیر" کا مطلب یہ ہوا کہ بشر" اور ھندوانی" کا ایک ہی نظریہ ہے۔

---

[1] (یعنی ھندوانی نے خود اپنے قول کی اس دوسرے قول سے شرح فرمائی ہے---(مترجم)

[2] (دوسرے نظریے کا خلاصہ یہ ہوا کہ ادنیٰ جہر دوسرے کو اپنی آواز سنانا ہے اور ادنیٰ سر اپنے آپ کو اپنی آواز سنانا ہے۔ بہت سارے علماء و فقہاء اسی نظریے کے ماننے والے ہیں جیسا کہ اوپر ان کے نام آچکے ہیں---(مترجم)

حالانکہ یہ بات خلاف ظاہر ہے کیونکہ فقہاء کی عبارت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں تین اقوال ہیں۔ حضرت کرخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرات تصحیح حروف کا نام ہے۔ اگرچہ آواز ایسی نہ ہو جسے سنا جاسکے۔ علامہ بشر رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ ضروری ہے کہ کسی طریقے سے آواز سنائی دے۔ جناب ہندوانی کا ارشاد ہے کہ کلام کو بہرحال مسموع ہونا چاہیے۔ حلیتہ المحلی' البحر وغیرہ اسی طرح مذکورہ ہے۔ [1]

---

[1] (بقول علامہ بشر آواز پیدا ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ آواز خود اسے بھی نہ سنائی دے اور بقول حضرت ہندوانی خود اسے آواز کا سنائی دینا شرط ہے۔ یہاں تک کہ حضرت مصنف نے سر وجہر کی بحث لغت و فقہاء کی آراء سے بڑی وضاحت سے بیان فرمادی۔ (مترجم)

باب اول

ذکر جہر کا حکم

واضح رہنا چاہیے کہ اس حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ کچھ حضرات نے کہا ذکر جہر جائز ہے۔ کچھ کا ارشاد ہے کہ مکروہ ہے۔ کچھ فرماتے ہیں حرام ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان مقامات کے علاوہ جہاں شریعت نے جہر کا حکم دیا ہے (اور آگے ان مقامات کا ذکر آ رہا ہے)

ہدایہ میں تکبیرات تشریق کی فصل میں یوں لکھا ہے "تکبیرات تشریق کو یوم عرفہ (حج) صبح کی نماز کی بعد شروع کرے اور نماز عصر کے بعد ختم کرے۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ صاحبین (امام یوسف اور امام محمد) فرماتے ہیں کہ ایام تشریق کے آخری دن (تیرہ ذی الحجہ) عصر کی نماز کے بعد یہ تلبیہ ختم کرے۔

یہ مسئلہ صحابہ کرام میں بھی اختلافی رہا ہے۔ صاحبین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول لیا ہے۔ کیونکہ احتیاط اس میں ہے کہ عبادات کے سلسلہ میں اکثر کو لیا جائے۔ امام اعظم نے ابن مسعود کا قول لیا ہے اور انہوں نے اقل کو اس لیے لیا ہے کہ تکبیرات میں جہر بدعت ہے"۔

"فتح القدیر" میں ہے کہ مصنف کا یہ کہنا کہ عید الفطر میں نماز عید کے لیے جاتے ہوئے تکبیر نہ کہے، محل نظر ہے۔ کیونکہ اختلاف اصل تکبیر میں نہیں ہے بلکہ بلند آواز سے کہنے میں ہے۔ یہ تکبیر اللہ تعالیٰ کے عام ذکر میں شامل ہے تو صاحبین فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ کی طرح جہر سے یہ تکبیر کہے اور امام اعظم کا ارشاد ہے کہ عید الاضحیٰ کی طرح عید فطر کی تکبیر کو بلند آواز سے نہ کہے۔

"خلاصہ" میں لکھا ہے کہ آئمہ ثلاثہ کا اختلاف اصل تکبیر میں ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کا ذکر کسی وقت میں بھی ممنوع نہیں ہے۔ منع صرف یہ ہے کہ اسے بدعت کے انداز سے نہ کیا جائے تو امام اعظم نے فرمایا کہ ذکر کے وقت آواز کو بلند کرنا بدعت ہے اور یہ اس آیہ کریمہ کے خلاف ہے کہ "اپنے پروردگار کو اپنے جی میں عاجزی اور آہستگی سے یاد کیجئے، قول جہری سے نہیں"

لہٰذا ذکر میں جہر صرف وہاں ہو گا جہاں حکم شرعی وارد ہو گا اور حکم شرعی اضحیٰ (عید قربان) میں آیا ہے اور اس سلسلے میں اللہ کریم کا ارشاد ہے "ان گنتی کے مخصوص ایام میں اللہ کریم کا ذکر کرو"۔

تفاسیر میں ہے کہ اس سے مراد یہی تکبیر ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسی پر اکتفا کیا جائے۔

ایک سوال

اللہ کریم کا ارشاد ہے "تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی عظمت بیان کرو (تکبیر کہو) کہ اس نے تمہیں ہدایت دی"۔

امام دار قطنی نے سالم سے روایت کی ہے کہ انہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب عید فطر کو گھر سے نماز کے لیئے باہر تشریف لے جاتے تو عید گاہ پہنچنے تک راستے میں تکبیر فرماتے۔[1]

جواب

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نماز عید میں تکبیر ہے مگر آیت میں تو عام حکم ہے کہ جیسا بھی ذکر ہو خواہ وہ راستے میں ہو یا نہ ہو۔[2] رہی مذکورہ حدیث تو وہ ضعیف ہے۔

---

[1] (قرآن و سنت سے ثابت ہوا کہ عید الفطر میں بھی عرش وقار علیہ السلام بلند آواز سے تکبیر پڑھا کرتے تھے پھر امام اعظم کے نزدیک خلاف حکم شرع کیسے ہوئی۔

[2] (یعنی عام ذکر کا آیت میں حکم ہے اسے عید فطر کی تکبیر کے ساتھ خاص کرنا عام کی عمومیت کے خلاف ہے)

کیونکہ اس کے ایک راوی کا نام موسیٰ بن محمد بن عطا مقدسی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ پھر متن حدیث میں یہ بھی تو نہیں ہے کہ تکبیر بلند آواز سے پڑھتے تھے اختلاف تو بلند آواز سے پڑھنے میں ہے۔ تکبیر کہنے میں تو اختلاف نہیں ہے۔ مزید یہ کہ حاکم نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے مگر انہوں نے جہر کا ذکر نہیں کیا۔ دار قطنی نے یہ حدیث رافع سے نقل کی ہے اور بجائے مرفوع کے اسے ابن عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف قرار دیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جب عید فطر یا عید الاضحیٰ کی نماز کے لیے نکلتے تھے تو بلند آواز سے تکبیر کہتے تھے۔

امام بیہقی نے بھی فرمایا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے مرفوع نہیں۔ پھر اس بات کا خیال بھی ضروری ہے کہ صحابی کا قول ایک قطعی آیت کے معارض و مقابل نہیں لایا جا سکتا۔ آیت یہی ہے کہ اپنے پروردگار کا ذکر اپنے جی میں کیجئے۔

اور سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے "بہترین ذکر خفی ہے"۔

پھر ابن عمر کا قول ایک اور صحابی کے قول کے خلاف ہے۔ وہ ابن عباس کا قول ہے۔ کہ انہوں نے لوگوں کو بلند آواز سے (عید الفطر کے موقع پر) تکبیر کہتے سنا تو فرمایا کیا امام نے بھی تکبیر پڑھی ہے۔ آپ کو عرض کیا گیا جی نہیں تو آپ نے فرمایا کیا ان لوگوں کو جنون ہو گیا ہے۔ ہم نے ایسا دن سرکار علیہ السلام کی حیات طیبہ میں پایا تو ہم میں سے کوئی بھی امام کی تکبیر سے پہلے تکبیر نہیں کہا کرتا تھا۔

"غایۃ البیان" میں ہے کہ متن میں یہ عبارت کہ عید الفطر میں تکبیر نہ کہے اس سے مراد یہ ہے کہ بلند آواز سے تکبیر نہ کہی جائے۔ کیونکہ بذات خود تو تکبیر بہتر شے ہے۔ سرا اس کے ادا کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر رازی نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر میں افضل یہ ہے کہ اسے آہستہ (اخفا) میں کہا جائے۔ کیونکہ فرمان خداوندی ہے "اپنے پروردگار کو عاجزی اور آہستگی سے یاد کرو" اور سرکار عرش وقار علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے "بہترین ذکر خفی ہے"۔

شریعت نے اضحیٰ کے جہر کا حکم دیا ہے۔ تو عید الفطر کو اس پر قیاس نہیں کر سکتے۔

کیونکہ جہر خلاف اصل ہے۔ ملخصاً [1]

عینی کی کتاب "نہایتہ شرح الھدایہ" میں ہے کہ علامہ ابوبکر رازی نے فرمایا ہمارے مشائخ کا ارشاد ہے کہ ایام تشریق اور اضحیٰ کے بغیر جہری تکبیر نہیں ہاں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے اور چور (کی اطلاع کے لیے بھی) جہری تکبیر جائز ہے۔ اسی طرح کوئی جل رہا ہو یا اور خوفناک مواقع ہوں تو بلند آواز سے تکبیر کہی جا سکتی ہے۔

در مختار کے باب مایفسد الصلوۃ و مایکرہ (نماز کو توڑنے والی اور مکروہ چیزیں) میں احکام مسجد کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے فرمایا "مسجد میں سوال کرنا حرام ہے اور کسی کو سوال کرنے پر دینا بھی مطلقاً مکروہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر پہلی صفوں میں جانا بھی مکروہ ہے۔ اسی طرح گم شدہ چیز کا اعلان بھی مکروہ ہے۔ اسی طرح کوئی شعر پڑھنا بھی مکروہ ہے۔ ہاں ایسا شعر پڑھا جا سکتا ہے جس میں اللہ و رسول کی مدح ہو۔ [2] اونچی آواز سے ذکر بھی مکروہ ہے ہاں علم فقہ کا طالب علم بلند آواز سے پڑھ سکتا ہے"۔ یہ عبارت "در مختار" کے فاضل مصنف نے "الاشباہ والنظائر" سے لی ہے۔

"تعالیق الانوار" حاشیہ "در مختار" میں ہے کہ متن میں یہ کہنا "ذکر میں آواز بلند کرنا مکروہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ مسجد میں بلند آواز سے تہلیل (لا الہ الا اللہ پڑھنا) کر رہے تھے۔ فرمایا میں تمہیں بدعتی پاتا ہوں۔ پھر حکم دیا کہ انہیں مسجد سے نکال دیا جائے"۔ لیکن علامہ حقی رحمتہ اللہ علیہ اپنے رسالے "فضل التسبیح والتہلیل" میں فرماتے ہیں کہ جو کچھ حضرت ابن مسعود سے نقل کیا گیا ہے یہ ثابت نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ "کتاب الزھد" میں حضرت ابو وائل کی سند سے یوں منقول ہے "یہ لوگ جن کا گمان یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ذکر سے منع فرمایا کرتے تھے (سراسر غلط ہے) میں تو جب بھی ان کی محفل میں بیٹھا

---

1. (یہ دعویٰ کہ جہر خلاف اصل ہے صحیح نہیں۔ ہم ابتدائیہ میں اس پر بحث کر چکے ہیں۔ (مترجم)
2. (اس طرح تو پھر ذکر جہر ہو جائے گا جسے ان فقہاء نے مکروہ سمجھا ہے۔ (مترجم)

انہوں نے بلند آواز سے اللہ کریم کا ذکر فرمایا۔

ذکر میں بلند آواز رکھنے کے بارے میں بیہقی میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مسجد میں بلند آواز سے ذکر کرتے ہوئے ایک شخص گزرا تو آپ سے عرض کیا گیا یارسول اللہ سلام اللہ علیک ہو سکتا ہے یہ شخص ریاکار ہو۔ سرکار کریم علیہ التسلیم نے فرمایا نہیں یہ شخص تو اواہ ہے۔ اواہ وہ ہوتا ہے جو عشق کی گرمی کی وجہ سے بہت زیادہ درد رکھتا ہو۔ [1] یہ حدیث بلند آواز سے ذکر کرنے کا ثبوت مہیا فرماتی ہے۔ فتاویٰ بزازیہ میں قاضی خان کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ذکر میں بلند آواز کرنا حرام ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت میں آیا ہے:

"کچھ لوگ مسجد میں اکٹھے ہوئے اور جہراً کلمہ طیبہ اور درود شریف پڑھنے لگ گئے تو آپ نے انہیں ڈانٹ پلائی اور فرمایا دور نبوی میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں تو تمہیں بدعتی پاتا ہوں اور یہی بات دہراتے رہے اور انہیں مسجد سے نکال دیا۔

ایک سوال

اگر آپ یہ کہہ دیں کہ فتاویٰ مذکور میں مسجد میں بلند آواز سے ذکر کی ممانعت اس لیے نہیں کی جاسکتی کہ یہ ممانعت اس آیت کریمہ کے خلاف جاتی ہے اور اس ممانعت سے بچنا ضروری ہے اللہ کریم کا ارشاد ہے "اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتا ہے کہ ان میں اس کے پاک نام کا ذکر ہو" ابن مسعود کا منع فرمادینا اس آیت کے خلاف ہے (لہٰذا یہ قابل قبول نہیں)

جواب

میں کہتا ہوں مسجد سے نکالنے کی نسبت اگر حضرت ابن مسعود کی طرف حقیقتاً ہو تو ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے اس اعتقاد کی وجہ سے ہو کہ مسجدیں صرف عبادت کے لیے ہیں اور

---

[1] (یعنی محبت خداوندی کی وجہ سے اس کا سینہ دردوں کا خزینہ ہوتا ہے۔ یہ پیارا لفظ (اواہ) قرآن پاک نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ انہیں اواہ اور حلیم فرمایا۔ مطلب یہ ہوا کہ عشق کی شدید گرمی کو اور حرارت کو وہ برداشت فرمارہے ہیں۔ مترجم)

ان میں لوگوں کو تعلیم دینا بدعت ہے۔ جائز فعل بھی کبھی کسی غرض کی وجہ سے ناجائز ہو جاتا ہے۔ اللہ کریم کا سورۂ اعراف میں ارشاد ہے "اپنے پروردگار کو عاجزی وزاری اور آہستگی سے پکارو" یعنی اللہ کی عبادت کرو اپنی ضروریات اس کے سامنے پیش کرو۔ ضراعت (تضرع کا ثلاثی مجرد) کا مطلب عاجزی وذلت ہے۔

صحیح حدیث میں یہ بھی مروی ہے کہ سرکار عرش وقار علیہ السلام نے بلند آواز سے تکبیر کہنے والوں کو ارشاد فرمایا اپنی جانوں کو سکون دو نہ تو تم بہرے سے ہم کلام ہو اور نہ غائب سے بات کر رہے ہو۔ تم تو سمیع وقریب کو پکار رہے ہو"۔

احتمال ہو سکتا ہے کہ وہاں آواز بلند کرنے میں کوئی مصلحت نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سفر جہاد ہو اور آواز بلند کرنے میں خوف ہو۔ جنگ تو ایک چال ہوتی ہے۔ اسی بنا پر جہاد کے دوران حضور علیہ السلام نے گھنٹیوں سے بھی منع فرما دیا تھا۔ [۱]

بہرحال ذکر جہر تو جائز ہے۔ اذان' خطبہ اور حج میں ذکر جہر ہوتا ہے۔

تکبیر تشریق میں یہ اختلاف کہ کتنی تکبیروں میں جہر ہو' اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ذکر جہر بدعت ہے۔ کیونکہ اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ سنت زائدہ ہیں یا نہیں (اس بات میں اختلاف نہیں کہ یہ جہراً ہیں یا سراً)

اس اختلاف کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ ظہر سے پہلے کی چار سنتیں ایک سلام سے ہیں یا دو سلاموں سے' تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ دو سلاموں سے بدعت یا حرام ہیں۔

ایک اور سوال

"فتاویٰ خیریہ" میں ہے کہ دمشق میں حضرت شیخ ابراہیم سے پوچھا گیا کہ سادات

---

۱ (اگر جانوروں کے گلوں میں گھنٹیاں ہوں تو ان کی آواز سے دشمن کو پتہ چل جاتا ہے کہ فریق مخالف آ رہا ہے اور وہ سنبھل جاتے ہیں یا اچانک حملہ کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس مصلحت کے تحت آپ علیہ السلام نے گھنٹیوں سے روک دیا تو اسی طرح بلند آواز سے بھی روکا کہ دشمن کو پتہ نہ چل سکے۔۔۔ مترجم)

صوفیہ کرام ذکر جہری کے حلقے قائم فرماتے ہیں۔ یہ مساجد میں ہوتا ہے اور اولیاء کرام کا یہ سلسلہ آباؤ اجداد سے جاری و ساری ہے۔ وہ ان محافل میں صوفیانہ قصائد بھی پڑھتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ان حضرات پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح شعر پڑھنا اور ذکر جہر کرنا جائز نہیں ہے تو کیا ان لوگوں کا صوفیا کے خلاف اعتراض حکم شرعی کے مطابق ہے؟

حضرت دمشقی کی طرف سے جواب

حضرت ابراہیم دمشقی نے جواب دیا ذکر کے حلقے اور ذکر جہر اور قصائد کا پڑھنا حدیث میں ایسی باتیں موجود ہیں جو ان اعمال کا تقاضا کرتی ہیں۔ مثلاً "ارشاد ہے "اگر ذکر کرنے والا میرا ذکر اپنی جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر ایسے گروہ میں کرتا ہوں جو اس کے گروہ اور جماعت سے بہتر ہوتا ہے" یہ حدیث بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمد رضی اللہ عنہ نے صحیح سندوں کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ یہ تو واضح بات ہے کہ گروہ اور جماعت میں ذکر جہری ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح حدیث میں ذکر کے حلقوں کا بھی ذکر ہے اور وہاں فرشتوں کی حاضری (طواف) کا ذکر بھی ہے۔ اس موضوع پر کئی احادیث مروی ہیں۔

ہاں کئی احادیث وہ بھی ہیں جن میں ذکر خفی کا مطالبہ فرمایا گیا ہے۔ ان دونوں قسم کی احادیث میں یوں تطبیق دیں گے کہ سب معمول بہ بن جائیں اور کوئی حدیث چھوڑی نہ جائے۔ بات یوں ہے کہ یہ اختلاف اشخاص اور حالات کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح قرآن کی تلاوت کے بارے میں جہر و سر کی روایات آتی ہیں تو وہاں بھی یہی جواب دیا گیا ہے کہ اشخاص اور حالات کی وجہ سے دو قسم کی احادیث ہیں۔ [1]

---

[1] (مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ خلوت و خاموشی کو پسند کرتے ہیں اور کچھ جلوت و جہر کے عادی ہوتے ہیں۔ لہٰذا صاحب شریعت ﷺ نے امت کے سب طبقات کی طبیعتوں کی رعایت فرماتے ہوئے دونوں اندازوں کو جائز قرار دے کر اپنی رحمۃ للعلمینی کی وسعتوں میں سب کو سمو دیا۔ حالات کے اختلاف کا مطلب بھی یہی ہے کہ کچھ مقامات بلند آواز کو قبول نہیں کرتے۔ مثلاً جنگ میں آپ اپنا سفر دشمنوں سے چھپانا چاہتے ہیں تو وہاں بلند آواز سے ذکر ممنوع ہو گا۔ کچھ لوگ تھکے ہارے ہیں اور سو رہے ہیں تو ان کے پاس بھی ذکر جہر ممنوع ہو گا۔ جہاں لوگ شوق سے ذکر کے لیے ہی جمع ہوئے ہوں تو وہاں ذکر جہر جائز و مستحسن و مسنون ہو گا... مترجم)

یہ اس حدیث کے خلاف بھی نہیں جس میں مذکور ہے کہ "بہتر ذکر خفی ہے" کیونکہ جہاں ریا کاری یا نمازیوں اور سوئے ہوئے لوگوں کو تکلیف دینے کا خوف ہو تو وہاں ذکر خفی ہی بہتر ہو گا اور اہل علم نے ذکر فرمایا جہاں مذکورہ باتیں نہیں ہونگی وہاں ذکر جہر افضل ہو گا۔ کیونکہ اس سے ایک تو سامعین تک فائدہ پہنچے گا دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ اس سے ذاکر کا دل بیدار ہو گا۔ اب رہا اللہ کریم کا یہ ارشاد کہ "اپنے پروردگار کو اپنے جی میں یاد کرو" تو یہ بھی مکی ہے جیسے کہ خفی قرات والا حکم بھی مکی ہے کہ "قرات اونچی نہ کرو اور نہ بہت خفی کرو" یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی کہ جب مقصود تھا کہ مشرک قرات کو نہ سنیں تاکہ وہ قرآن کو گالیاں نہ دیں اور نہ ہی قرآن نازل کرنے والے پروردگار کو گالیاں دیں۔ اب چونکہ ایسے حالات نہیں تو جہر جائز ہے۔

امام مالک کے کچھ اساتذہ اور ابن جریر وغیرہ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن پاک کی قرات ہو رہی ہو تو اس کی تعظیم کی خاطر ذکر جہر نہ کرو اس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے متصل یہ الفاظ قرآن پاک میں موجود ہیں کہ "جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے سنو"۔ [1]

عالی مقام صوفیہ کا ارشاد ہے کہ آیت میں جو حکم ہے وہ سرکار عرش وقار علیہ السلام سے خاص ہے۔ آپ کے علاوہ باقی لوگ تو وسوسوں اور دنیاوی خیالات میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان کے لیے ذکر جہر بہتر ہو گا کیونکہ (وساوس و خواطر) کے کاٹنے میں ذکر جہر کا شدید اثر ہوتا ہے۔ صوفیہ کے اس قول کی تائید علامہ بزار رحمہ اللہ کی روایت کردہ اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ "تم میں سے جو رات کو نماز پڑھے تو جہری قرات کرے کیونکہ فرشتے اس کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں اور اس کی قرات سنتے ہیں"۔

اب رہی حد سے بڑھنے (اعتدار) کی بلند آوازی کی تفسیر جو اللہ کریم کے اس ارشاد میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا" تو وہ تفسیر درست نہیں ہے

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ آنے سے واضح ہو گیا کہ قرات قرآن ہو رہی ہو تو پاس ذکر جہر ممنوع ہے تاکہ قرات میں خلل واقع نہ ہو۔ مترجم)

کیونکہ اس کی راجح اور قابل اعتبار تفسیر یہ ہے کہ ماموں کی حد سے نہ بڑھا جائے۔ جہر و سری احادیث مبارکہ کے درمیان اس طرح تطبیق دینا لازم اور ضروری ہے جو بیان ہوا ہے۔

سوال

اگر آپ یہ کہیں کہ خانیہ میں لکھا ہے کہ "بلند آواز سے ذکر کرنا حرام ہے" کیونکہ سرکار علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد عالی ہے "جس شخص نے بلند آواز سے ذکر کیا اسے آپ نے فرمایا تو بہرے یا غائب کو نہیں بلا رہا" اسی طرح سید الانام علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "بہترین ذکر خفی ہے" میں جواباً عرض کرتا ہوں کہ اس سے مراد حد سے بڑھا ہوا جہر ہے۔

"الاشباہ" میں ہے کہ ان چند مقامات---- عید الاضحیٰ' یوم عرفہ' دشمن سے مقابلے' ڈاکوؤں سے مقابلے' آگ لگنے کے وقت اور خوفوں کے اوقات کے علاوہ بلند آواز سے تکبیر نہ کہی جائے۔ "غایۃ البیان میں یہی ہے۔

"طحطاوی شرح مراقی الفلاح" میں یوں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ کیا سری ذکر افضل ہے تو جواب میں کہا گیا ہاں افضل ہے۔ کیونکہ اس پر بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ جہری ذکر افضل ہے۔ کیونکہ بہت سی احادیث سے یہی ثابت ہے اور ان احادیث کو یوں جمع کر لیا گیا کہ حالات اور اشخاص کے اختلاف سے یہ احادیث الگ الگ آئی ہیں۔

"البحر الرائق" میں وہاں مذکور ہے جہاں عید فطر کے دن راستے میں تکبیر پڑھنے کی بحث ہے۔ مصنف نے "فتح القدیر" وغیرہ کی عبارت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ حاصل کلام یہ ہے کہ بلند آواز سے تکبیر پڑھنا بدعت ہے۔ ہاں صرف ان جگہوں پر بلند تکبیر پڑھی جا سکتی ہے جو مستثنیٰ ہیں۔

قاضی خان نے اپنے فتاویٰ میں ذکر جہر کو مکروہ کہا ہے۔ "مصفی" کے مصنف نے اس مسئلے میں قاضی خان کی اتباع کرتے ہوئے مکروہ کہا ہے۔

"فتاویٰ علامیہ" میں ہے کہ صوفیہ کو بلند آواز کرنے اور تالی بجانے سے روکا جائے۔ عینی نے "تحفہ" کی شرح میں اسے صراحتاً" حرام کہا ہے۔ اور صوفی ہونے کا جو بھی

مدعی ایسا کرتا ہے' اسے طعن و تشنیع کی ہے۔ "قنیہ" میں اس حکم سے جو آج ہمارے زمانے میں آئمہ کرام کرتے ہیں' اسے مستثنیٰ قرار دے کر (جائز کہا) پھر فرمایا ہر صبح جماعت کے بعد لوگوں کی جو عادت ہے کہ بلند آواز سے آیت الکرسی' سورۂ بقرۃ کی آخری آیات اور شھد اللہ والی آیات پڑھتے ہیں تو اس میں حرج نہیں لیکن افضل یہ ہے کہ آہستہ پڑھیں۔ مزید فرمایا کہ ایام تشریق کے بعد جہری تکبیر مسنون نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ دشمن یا چوروں کا مقابلہ ہو۔ کچھ فقہاء نے اس پر قیاس کرتے ہوئے آگ لگنے اور ہر قسم کے خطرناک اور خوفناک واقعات میں بھی جہری تکبیر کو جائز قرار دیا ہے۔ "قنیہ" کے مصنف ایک اور مقام پر فرماتے ہیں اگر جج کے پاس بہت بڑا مجمع ہو اور وہ سب مل کر تسبیح (سبحان اللہ) و تہلیل (لا الہ الا اللہ پڑھنا) کر رہے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔

مصنف (علامہ عبدالحئی لکھنوی) کا تبصرہ

میں کہتا ہوں اللہ کریم توفیق دے تو تحقیق تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ تھیں ہمارے فقہاء کی عبارات' آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان کی آراء میں کتنا اضطراب ہے اور ان کے اقوال میں کتنا اختلاف ہے۔ کچھ نے تو جائز قرار دیا' کچھ نے حرام کہا' کچھ نے بدعت فرمایا اور کچھ نے مکروہ سمجھا اور راجح بات یہ ہے کہ اگر جہر حد سے نہ بڑھے تو جائز ہے۔ یہی بات خیر رملی نے اختیار فرمائی۔

ہم سب سے پہلے وہ دلائل ذکر کریں گے جن کو سامنے رکھ کر فقہاء نے ذکر جہر سے روکا۔ ہم ساتھ ہی ساتھ اس ممانعت کا دفاع کریں گے پھر جواز کے دلائل ذکر کرتے ہوئے وہ اضطراب دور کرنے کی کوشش بھی آخر میں کریں گے جو ان کی عبارات میں واقع ہوا ہے۔ اب غور سے سنئے جنہوں نے ذکر جہری سے منع فرمایا ہے انہوں نے کئی انداز سے دلائل دیے ہیں۔

ذکر جہر نہ کرنے کے دلائل

پہلی دلیل: ارشاد ربانی ہے "اپنے پروردگار کا ذکر اپنے جی میں عاجزی اور آہستگی سے کیجئے۔ بلند آواز سے نہ ہو (اور یہ ذکر) صبح و شام جاری رہے"۔

یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ ذکر کا معاملہ آہستگی سے ہونا چاہیے تو واضح بات ہے کہ جہر ان مواقع کے بغیر ممنوع ہوگا جہاں شریعت نے اجازت دی ہے۔

اس دلیل کا جواب

کئی طریقوں سے اس دلیل کا جواب دیا جاسکتا ہے۔

۱- محترم المقام صوفیہ نے اس کا وہ جواب دیا ہے جو ان کے نزدیک تو واضح ہے مگر ہمیں معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ حکم سرکار سید الکل علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں کوئی اور شامل نہیں ہے۔ [۱]

۲- یہ حکم نہ فرض ہے اور نہ ہی واجب ہے کہ اس کے خلاف حرام یا مکروہ ہو بلکہ یہ ارشادی امر ہے جو اللہ کریم کے ان الفاظ "عاجزی اور آہستگی" سے واضح ہے۔ [۲]

۳- اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن سن رہے ہو تو ذکر جہر نہ کرو کیونکہ اس آیت کے ساتھ یہ الفاظ موجود ہیں "جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے" تو اب مطلب یہ ہوگا کہ اے خاموش شخص اپنے جی میں اپنے پروردگار کو عاجزی اور خاموشی سے یاد کرتا رہ۔ اسی طرح ابن جریر اور ابو الشیخ نے ابن زید سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

حضرت سیوطی اپنی کتاب "نتیجہ الفکر" میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب خاموش رہنے کا حکم مل گیا تو خوف تھا کہ وہ شخص ست پڑ کر ذکر چھوڑ ہی نہ دے تو اسے تنبیہ فرمائی گئی کہ اگرچہ حکم تو خاموشی کا ہے مگر اسے ذکر قلبی کو نہیں چھوڑنا ہے تاکہ وہ اللہ کے ذکر سے غافل

---

[۱] لہٰذا کوئی اور ذکر جہر کرنا چاہے تو یہ آیت رکاوٹ نہیں۔ مترجم)

[۲] یہاں امر وجوب کے لیے نہیں، بلکہ صرف اباحت کے لیے ہے اور قرآن میں کئی جگہ اباحتی امر آتا ہے۔ حج سے فراغت پر فرمایا کہ شکار کرو، اب اس سے مراد یہ نہیں کہ حج سے فارغ ہوتے ہی شکار کرنا فرض یا واجب ہو گیا اس امر سے مطلب صرف یہ تھا کہ اب شکار تمہارے لیے جائز ہے۔ اسی طرح یہاں بھی امر صرف جواز کے لیے ہے، وجوب کے لیے نہیں۔ مترجم)

نہ رہے۔ اسی لیے آخری فقرہ یہ آیا کہ (تو غافلوں میں سے نہ ہو) اب آیت کا مطلب یہ نہ ہوا کہ جہر منع ہے۔

۴۔ یہ آیت تو ایسے جہر کا اثبات کرتی ہے جو حد سے بڑھا ہوا نہ ہو۔ اس سے روکتی نہیں ہے۔ اس دلیل کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اپنے پروردگار کو جی میں ذکر کیجئے" مطلب یہ ہے کہ خفیہ اور آہستہ ذکر کیجئے اور اس فقرے کہ "بلند آواز سے نہ ہو" کہ حد سے بلند آواز نہ ہو تو پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ذکر اس طرح کیجئے کہ وہ آہستگی اور جہر کے درمیان ہو۔ یہی بات دوسرے مقام پر قرآن پاک میں یوں مذکور ہے "اپنی قرات کو نہ بہت اونچا کیجئے اور نہ ہی بالکل آہستہ۔ اس کے درمیان راستہ تلاش کیجئے۔

تو اب آیت زیر بحث سے سرو جہر دونوں کا جواز ثابت ہوا۔ ہاں سر کی فضیلت یہ ہے کہ اس میں عاجزی اور خفا ہے۔ [ل]

دوسری دلیل

جہر سے منع کرنے والوں کے نزدیک یہ سب سے قوی دلیل ہے۔ ابن ابی شیبہ' امام احمد بن حنبل' ابن مردویہ اور امام بیہقی (رحمتہ اللہ علیہم) نے کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ ہم ایک جہاد میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ جب ہم کسی وادی میں اُترتے یا کسی بلندی پر چڑھتے تو بلند آواز سے تکبیر کہتے۔ سرکار علیہ السلام ہمارے قریب تشریف لائے اور فرمایا اے لوگو! اپنی جانوں کو پرسکون رکھو تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے تم تو صرف سمیع و بصیر سے ہم کلام ہو۔ جسے تم بلا رہے ہو' وہ تمہاری گردن سے بھی تمہارے قریب ہے۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں بھی مذکور ہے۔

امام ترمذی نے کتاب "الدعوات" کے باب فضل التسبیح وغیرہ میں اس سند سے

ل ان چار تفاسیر سے پتہ چلا کہ آیت مقدسہ ذکر جہر کی نفی نہیں فرماتی' بلکہ معتدل جہر کو جائز قرار دی ہے۔ خاص طور سے امام رازی کا استدلال بہت ہی قوی ہے یہ اصحاب علم سے مخفی نہیں۔ مترجم)

حدیث لی ہے۔ محمد بن بشار بن عبدالعزیز عطار سے روایت کرتے ہیں کہ ہمیں ابو نعامہ سعدی نے ابو عثمان ہندی سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اندس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ جب واپسی ہوئی اور مدینہ طیبہ سامنے آیا تو لوگوں نے بلند آواز سے تکبیر کہی۔ سرور عالم علیہ السلام نے فرمایا تمہارا رب نہ تو بہرہ ہے اور نہ تم سے غائب ہے۔ وہ ذات اقدس تو تمہارے درمیان ہے اور تمہارے اور تمہاری سواریوں کے سروں کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا اے عبداللہ بن قیس (ابو موسیٰ اشعری کا نام ہے) کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانے کی تعلیم نہ دوں! فرمایا لاحول ولاقوۃ الا باللہ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔ نہدی راوی کا نام عبدالرحمٰن ہے۔ ابو نعامہ کا نام عمرو بن عیسیٰ ہے۔ حدیث میں یہ فرمایا کہ وہ تمہارے درمیان ہے' اس کا مطلب علم وقدرت میں ساتھ ہونا ہے۔

امام مسلم نے کتاب الذکر کے باب استجاب خفض الصوت بالذکر میں (ذکر میں آواز کو پست رکھنا مستحب ہے) یہ حدیث اس سند سے نقل فرمائی ہے:

ہمیں ابو بکر بن شیبہ نے حدیث بتائی۔ انہیں محمد بن فضیل اور ابو معاویہ نے عاصم بن عثمان سے یہ حدیث پہنچائی کہ حضرت ابو موسیٰ نے فرمایا ہم ایک سفر میں نبی پاک علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ لوگ بلند تکبیر کہنے لگے تو آپ نے فرمایا لوگو اپنی جانوں کو آرام وسکون دو۔ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو۔ تم تو سمیع و قریب کو پکار رہے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ ہے۔ ابو موسیٰ کہتے ہیں میں حضور علیہ السلام کے پیچھے پیچھے تھا اور میں لا حول ولاقوۃ الا باللہ کہہ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا اے عبداللہ! کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانے کی تعلیم نہ دوں؟ میں نے عرض کیا حضور ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا لاحول ولاقوۃ الا باللہ (ہی ایسا خزانہ ہے)

دوسری سند میں یہی حدیث ابن نمیر اور اسحاق بن ابراہیم اور ابو سعید الشیخ نے خفض بن غیاث سے بذریعہ عاصم روایت کی ہے۔ تیسری سند یوں ہے ابو کامل فضیل بن حسین نے بذریعہ یزید بن زریع حدیث بیان کی کہ میں نے ابو عثمان سے روایت کرتے

ہوئے سیدنا ابو موسیٰ سے یوں نقل کیا کہ وہ رسول مکرم علیہ السلام کے ساتھ تھے وہ گھاٹی سے چڑھ رہے تھے کہ ایک آدمی جب کسی چڑھائی پر چڑھتا بلند آواز سے لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہتا۔ (یہ سن کر) سرکار علیہ السلام نے فرمایا تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں بلا رہے ہو۔ اگلی حدیث کی سند یوں ہے اسحاق بن ابراہیم نے ہمیں حدیث بتائی۔ انہیں ثقفی نے بتائی۔ انہیں خالد حذاء نے ابو عثمان سے یہ روایت سنائی کہ ہم ایک غزوہ میں نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ تھے۔ آگے پوری حدیث بیان کر دی۔ اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں (جن کا معنی یہ ہے) جسے تم پکار رہے ہو وہ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے۔ [1]

امام نووی نے مسلم شریف کی شرح میں (اس حدیث کے الفاظ کی) یوں تشریح فرمائی ہے اربعوا میں ہمزہ وصلی ہے با (موحدہ) پر زبر ہے۔ [2] اس کا معنی یہ ہے کہ اپنی جانوں کو آرام پہنچاؤ اور آوازیں پست رکھو کیونکہ انسان بلند آواز اس وقت کرتا ہے جب اس کا مخاطب دور ہو ورنہ مستحب یہ ہے کہ آواز پست رکھے۔ ہاں اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو بے شک بلند آواز کرے جب آواز پست ہوگی تو توقیر و تعظیم میں اضافہ ہوگا ہاں اگر حاجت آواز بلند کرنے کی ہو تو بلند کی جاسکتی ہے۔

امام ابو داؤد نے کتاب "الصلوۃ" کے باب الاستغفار میں موسیٰ بن اسماعیل سے روایت کی ہے کہ ہمیں حماد بن ثابت، علی بن زید اور سعید بن جریری سے یہ حدیث روایت کرتے ہوئے بتائی، یہ حضرات ابو عثمان سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا جب صحابہ کرام مدینہ کے قریب پہنچے تو کچھ لوگوں نے تکبیر کہی۔ اپنی آوازیں خوب بلند

---

[1] امام مسلم نے چاروں سندوں سے یہ روایت کی۔ سندیں جتنی زیادہ ہوں حدیث اتنی ہی قوی ہو جاتی ہے، لہٰذا علامہ عبد الحیٔ نے سب سندیں اس غرض کے لیے امام مسلم کے حوالے سے جمع کر دیں۔ (مترجم)

[2] یعنی یہ باب فتح ہے۔ مترجم)

کیں۔ سرکار رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو جسے تم پکار رہے ہو تمہارے اور تمہاری سواریوں کی گردنوں کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا اے ابو موسیٰ کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانے کی خبر نہ دوں (الحدیث)

دوسری سند یوں ہے کہ ہمیں مسدد نے انہیں یزید بن زریع نے انہیں سلیمان تمیمی نے، انہیں ابو عثمان نے، حضرت ابو موسیٰ سے حدیث بیان کی کہ وہ رسول محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک گھاٹی سے چڑھ رہے تھے کہ ایک آدمی جب بھی گھاٹی سے چڑھتا (آگے حدیث مسلم کی حدیث کی طرح ہے)

تیسری سند یوں ہے کہ ہمیں ابو صالح نے ابو اسحاق فزاری سے انہوں نے عاصم سے انہوں نے ابو عثمان سے انہوں نے حضرت ابو موسیٰ سے حدیث بیان کی اس میں الفاظ یوں ہیں (جن کا معنی یہ ہے) اے لوگو! اپنی جانوں کو پر سکون رکھو جیسا کہ مسلم میں ہے۔ [1]

امام بخاری نے کتاب السیر کے باب --- ما یکرہ من رفع الصوت فی التکبیر (تکبیر میں بلند آواز کرنے کی کراہت کا باب) میں یوں روایت کیا ہے۔ ہمیں محمد بن یوسف نے انہیں سفیان نے انہیں عاصم احوال نے انہیں ابو عثمان نے انہیں حضرت ابو موسیٰ اشعری نے حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم رسول اقدس علیہ السلام کے ساتھ تھے تو جب کسی بلند پہاڑی پر چڑھتے تو تکبیر و تہلیل کہتے اور اپنی آوازوں کو بلند کرتے آپ نے فرمایا، اے لوگو! اپنی جانوں کو سکون سے رکھو آگے مسلم کی طرح روایت ہے۔

ارشاد الباری (شرح بخاری) میں قسطلانی نے فرمایا کہ طبری کا ارشاد ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ ذکر و دعائیں بلند آواز سے مکروہ ہیں، عام اسلاف، صحابہ تابعین کا یہی قول ہے۔

ابن ماجہ اور نسائی نے بھی حسب قول سیوطی رحمتہ اللہ یہ حدیث روایت کی ہے اس حدیث میں (ان سب اسناد کے ساتھ) ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نے ان کا بلند آواز

---

[1] مطلب یہ ہوا کہ امام ابو داؤد نے تین اسناد سے یہ حدیث نقل فرمائی ہے۔ مترجم)

سے ذکر کرنا ناپسند فرمایا' اب اگر ذکر جہر حرام نہ بھی ہو تو مکروہ ضرور ہو گا۔ اس کا جواب دو طریقوں سے دیا گیا ہے۔

۱۔ لفظ اربعوا میں جو حکم ہے وہ واجب نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے جہر حرام یا مکروہ ہو' ایسا نہیں یہ حکم تو صرف آسانی کے لیے ہے۔ شیخ محدث دہلوی نے لمعات شرح مشکوۃ میں فرمایا' کہ اربعوا (پر سکون رہو) میں اشارہ ہے کہ جہر سے صرف آسانی و اکرام کے لیے منع فرمایا ہے اس لیے نہیں روکا کہ یہ غیر شرعی فعل ہے۔

اس سے تو صرف یہ ثابت ہو گا کہ ذکر خفی مستحب ہے اور اس میں تو کوئی اختلاف نہیں امام مسلم نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں باب کے عنوان میں بذات خود اسکی طرف اشارہ فرمایا ہے اور علامہ نووی نے شرح مسلم میں بھی ایسا ہی اشارہ کیا ہے۔

۲ جس جہر سے سرکار کریم علیہ التسلیم نے منع فرمایا وہ حد سے بڑھا ہوا تھا اس پر خود کچھ روایات کا بیان دلیل ہے۔ فتح الودود شرح سنن ابی داؤد میں ہے کہ یہ الفاظ "انہوں نے اپنی آوازیں بلند کیں" دلالت کرتے ہیں کہ جہر میں انہوں نے مبالغہ اور زیادتی کی تھی تو اب اس سے مطلق جہر ممنوع نہیں ہو گا۔

حرز ثمین شرح حصین حصین میں علامہ علی القاری رحمہ اللہ نے وان ذکرنی ملا (اگر وہ مجھے جماعت و گروہ میں ذکر کرتا ہے) کی شرح میں فرمایا' اس سے ذکر خفی کا احتمال بھی ہو سکتا ہے جس کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔ "اللہ کریم کا ذکر غافل لوگوں میں کرنا ایسا ہی ہے جیسے میدان جہاد سے بھاگ جانے والوں کا ساتھ نہ دے کر صبر کرنا ہے۔" اس حدیث میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ معنی ہو گروہ کے ساتھ مل کر ذکر کرنا مگر اس سے بھی وہ جہر ثابت نہیں ہوتا جو حد سے بڑھ کر نہ ہو کیونکہ حضور علیہ السلام نے اپنے کچھ صحابہ سے فرمایا' جب انہوں نے مبالغہ کے طور پر جہر کیا کہ اپنی جانوں کو سکون سے رکھو۔ [1]

۳ تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو منع نہ فرماتے اور

---

[1] مصنف یہ کہنا چاہتے تھے کہ ممنوع وہ جہر ہے جو حد سے بڑھا ہو تو علامہ علی القاری کی شرح سے اپنے اس قول پر دلیل ان آخری جملوں میں لائے ہیں۔ مترجم)

اس حالت پر انہیں قائم رکھتے تو صحابہ کرام کو ضرور یہ گمان ہوتا کہ سفر میں یا گھاٹی سے چڑھتے وقت بلند آواز سے ذکر کرنا سنت ہے' کیونکہ سنت قول و فعل سے بھی ثابت ہو جاتی ہے اور تقریر سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ [1]

چونکہ ایسا معاملہ نہیں تھا تو رسول اقدس نے اس سے روک دیا تاکہ سد ذرائع ہو اور امت کے لیے سہولت رہے' لیکن اس حدیث میں مطلقاً "جہر سے ممانعت نہیں' یہ بات قارئین سے مخفی نہیں۔ [2]

کچھ حضرات نے یہ جواب اس حدیث کے استدلال کا دیا ہے کہ کوئی مصلحت ہو تو جہر سے روکا جا سکتا ہے' چونکہ حضور علیہ السلام سفر جہاد میں تھے اور خوف یہ تھا کہ اگر آوازیں بلند ہو گئیں تو کافر سن لیں گے اور پھر مصیبت پڑ جائے گی اور حدیث میں یہ ثابت ہے کہ جنگ ایک چال ہے۔ [3]

بزازی نے یہ حدیث روایت کی ہے۔

یہ جواب اس لیے صحیح نہیں ہے کہ واقعہ تو جہاد سے واپسی کا ہے' ہاں بغوی رحمہ اللہ نے "معالم التنزیل" میں ایک روایت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ جہاد پر جاتے ہوئے پیش آیا بغوی کی روایت یوں ہے ہمیں احمد بن عبداللہ نے انہیں محمد بن یوسف نے انہیں اسماعیل نے انہیں عبدالواحد نے انہیں عاصم نے انہیں ابو عثمان نے انہیں حضرت ابو موسیٰ نے حدیث بتائی کہ جب حضور علیہ السلام نے غزوہ خیبر کا سفر فرمایا' اور جونہی خیبر کی طرف متوجہ ہوئے تو کچھ حضرات وادی کو جھانکتے ہی بلند آواز سے تکبیر

---

[1] تقریر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی صاحب سرکار علیہ السلام کی موجودگی میں کوئی کام کرے اور حضور اس سے منع نہ فرمائیں تو وہ کام شرعاً سنت ہو جاتا ہے' اور اس کا کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس موقع پر اگر صحابہ کو سرکار نہ روکتے تو پھر ایسے مقامات پر ذکر جہر مسنون ٹھہرتا۔ مترجم)

[2] مصنف نے فرمایا تھا' جواب دو طریقوں سے ہے' مگر انہوں نے جواب تین طریقوں سے دیا۔ (مترجم)

[3] لہٰذا یہاں خاموش رہا جائے تاکہ دشمن سن نہ سکے۔ مترجم)

پڑھنے لگ گئے۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر' لا الہ الا اللہ یہ سن کر نبی رحمت علیہ السلام نے فرمایا' اپنی جانوں کو پر سکون رکھو۔ الحدیث: اس حدیث سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ خیبر جاتے ہوئے یہ واقعہ پیش آیا' لیکن اکثر صحیح روایات میں بات یوں آئی ہے کہ یہ واقعہ واپسی پر مدینہ طیبہ کے قریب پیش آیا تھا یہ میری تحقیق ہے باقی حقیقت حال اللہ کریم بہتر جانتے ہیں۔ [1]

تیسری دلیل

ارشاد ربانی ہے۔ "بلند آواز سے قرات نہ کیجئے اور نہ ہی خفی قرات ہو اس کے درمیان کا انداز اپنایئے۔"

اس کے بھی کئی جواب ہیں۔

1 یہ آیت کریمہ مطلقاً "جہر سے نہیں روکتی بلکہ حد سے بڑھے جہر سے روکتی ہے' کیونکہ آخری الفاظ یہ ہیں کہ جہر و خفا کے درمیان کا راستہ تلاش کیا جائے' تو پھر یہ آیت تو ذکر جہر والوں کی دلیل ہے ذکر خفی والوں کی دلیل نہیں۔

2 یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب حضور علیہ السلام مکہ مکرمہ میں خفیہ تبلیغ فرماتے تھے' اور مشرکوں سے مخفی رہنا چاہتے تھے۔ جب آپ نے جہر سے تلاوت فرمائی تو مشرکین نے سن کر قرآن اور اس کے نازل کرنے والے کو گالیاں بکیں تو اللہ کریم نے اس وجہ سے جہر سے منع فرمایا' ارشاد ہوا کہ آپ قرآن کی قرات بلند آواز سے نماز میں نہ فرمائیں تاکہ کافر نہ سن سکیں اور گالیاں نہ بکیں۔ بالکل آہستہ بھی نہ ہو' یعنی نہ تو جہر جہیر (بہت بلند آواز) ہو' اور نہ ہی سر کثیر ہو۔ (یعنی بالکل خفی) بلکہ دونوں کے درمیان ہو۔ (حاضرین تو یہ دھیمی آواز سن لیں اور باہر گلیوں میں کافروں تک یہ آواز نہ پہنچ پائے۔)

بخاری اور ترمذی نے اسی طرح حدیث روایت کی ہے' ترمذی فرماتے ہیں۔

---

[1] اگر سفر پر جاتے ہوئے بھی دشمن کے موجود یا قریب نہ ہونے کا یقین ہو تو ذکر جہر سے روکنے کی کوئی مصلحت باقی نہیں رہتی' للذا غزوہ پر جاتے ہوئے ایسا ہو سکتا ہے۔ مترجم)

حدیث حسن و صحیح ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں یہ ممانعت مشرکوں کی ایذا اور سب و شتم کی وجہ سے تھی، جب یہ ایذاء نہ رہی تو رکاوٹ بھی ختم ہوگئی اس کی مثال اللہ کریم کا یہ ارشاد ہے۔ فرمایا، "تم ان (بتوں اور معبودان باطلہ) کو بھی گالی نہ دو، جن کی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر یہ عبادت کرتے ہیں کہ وہ زیادتی کرتے ہوئے علم کے بغیر اللہ کو گالی دینے لگیں۔"

اللہ کریم نے بتوں اور معبودان باطلہ کو گالی دینے سے روک دیا کہ اسی طرح وہ پھر اللہ کریم کو گالیاں دینے لگ جائیں گے اب یہ بات ختم ہو گئی ہے تو ممانعت بھی ختم ہو گئی ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۳ تیسرا جواب یہ ہے کہ آیت مقدسہ تشہد میں دعا کے بارے نازل ہوئی ہے۔ طبری رحمہ اللہ، ابن خزیمہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہی روایت کی ہے تو پھر اس سے مطلقاً ذکر جہر کی ممانعت ثابت نہیں ہو گی۔

ایک سوال

یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بخاری نے سیدہ عائشہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا، ولا تجھر بصلوتک "قرات میں جہر نہ کرو" والی آیت دعا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم جب گھر کے پاس نماز پڑھتے تو بلند آواز سے دعا فرماتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اب ان دونوں روایتوں میں یہ کہیں نہیں ہے کہ تشہد سے دعا خاص ہے تو معلوم ہوا کہ جہر مطلقاً ہر صورت میں ممنوع ہے۔

جواب

ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم یہ تسلیم ہی کر لیں کہ آیت کا مطلب جہر سے ممانعت ہے۔ خواہ وہ حد سے بڑھا ہوا نہ ہو پھر بھی یہ آیت شریفہ دعا کے بارے میں ہے۔ مطلقاً ذکر کے بارے میں نہیں ہے اور دعا میں خصوصیت سے خفا افضل ہے کہ وہ قبولیت کے قریب تر ہے، ہاں

اگر ضرورت پیش آئے تو دعا بھی جہراً کی جا سکتی ہے۔ بزازیہ میں ہے کہ وعظ و نصیحت کرنے والا شخص جب دعائے ماثورہ بلند آواز سے کرے اور تعلیم کی خاطر لوگ بھی اس کے ساتھ بلند آواز سے دعا مانگیں تو کوئی حرج نہیں ہے، ہاں اگر مل کر اسے عام کر دیں تو پھر جہر بدعت ہو گا۔

اسی لیے اللہ کریم نے سیدنا ذکریا علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے قصہ میں ارشاد فرمایا "جب اس نے اپنے پروردگار کو خفی ندا سے پکارا" اسی لیے تو نماز میں استعاذہ (اعوذ باللہ) سب کے ہاں آہستہ پڑھا جاتا ہے کیونکہ وہ دعا ہے، لیکن ہمارا مطلوب تو یہ ثابت کرنا ہے کہ مطلق ذکر میں جہر منع ہے، تو اس دلیل سے یہ ثابت نہ ہو سکا۔

چوتھی دلیل

اللہ کریم کا ارشاد عالی ہے۔ "اپنے رب کریم کو عاجزی اور آہستگی سے پکارو یقیناً وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔"

زید بن اسلم نے اعتداء (زیادتی) کا مطلب بقول ابن ابی حاتم ذکر جہر لیا ہے۔ ابن جریر اور ابوالشیخ نے ابن جریج سے بھی یہی معنی نقل کیا ہے۔

جواب اس کے دو جواب ہیں۔

۱۔ ایک تو ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ دعا میں ایسی خصوصیت ہے جو باقی اذکار میں نہیں ہے، تو اب اگر دعا میں جہر منع ہو جائے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مطلقاً ذکر جہر باقی جگہوں پر بھی منع ہے۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ لفظ اعتداء کی تفسیر میں کئی اور اقوال بھی ہیں۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ اللہ کریم کے اس ارشاد لا یحب المعتدین "وہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا" کا مطلب یہ ہے کہ کسی مومن اور مومنہ کے لیے شر کی دعا نہ کرے کیونکہ زیادتی ہے۔ اسی طرح ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابو مجلز سے اس قول ربانی (لا یحب المعتدین) کا یہ معنی

کیا ہے کہ منازل انبیاء علیہم السلام اپنے لیے نہ مانگو۔

اس آیت مقدس کی وہ تفسیر سب سے اعلیٰ و راجح ہے۔ جس کی طرف امام سیوطی رحمتہ اللہ نے نتیجہ الفکر میں اور خیر رملی وغیرہ نے اشارہ کیا ہے کہ اعتداء سے مراد یہ ہے کہ جن باتوں کا شریعت نے حکم دیا ہے ان سے آگے بڑھ کر ایسی دعا کرنے لگ جائے جس کی اصل شریعت میں موجود نہیں ہے۔ اس پر دلیل وہ روایت بھی ہے جسے ابن ابی شیبہ عبد بن حمید۔ ابو داؤد' ابن ماجہ' ابن حبان' امام حاکم اور بیہقی نے عبد اللہ بن مغفل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ دعا مانگتے سنا "اے اللہ! میں آپ سے جب جنت میں داخل ہوں تو اس کی دائیں طرف سفید محل کا سوال کرتا ہوں۔" آپ نے فرمایا "بیٹا اللہ کریم سے جنت مانگو اور جہنم سے پناہ چاہو' میں نے رسول محترم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اس امت میں کچھ لوگ ہونگے جو دعا اور طہارت میں حد سے بڑھ جائیں گے۔"

عباسی' ابن ابی شیبہ حمد' ابو داؤد' ابن منذر' ابن ابی حاتم' ابو شیخ اور ابن مردویہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے سنا "اے اللہ! میں آپ سے جنت' اس کی نعمتیں اور اس کے ریشمی لباس مانگتا ہوں' اور جہنم' اس کی زنجیروں اور طوقوں سے پناہ چاہتا ہوں۔" یہ سن کر آپ نے کہا بیٹے! تم نے خیر کثیر مانگی ہے اور شر کثیر سے پناہ چاہی ہے' میں نے رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کو فرماتے سنا ہے کہ کچھ لوگ ہوں گے' جو دعا میں حد سے بڑھ جائیں گے' اور پھر یہ آیت پڑھی لا یحب المعتدین آپ کو صرف اتنا کہنا چاہیے تھا' اے اللہ میں آپ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور ایسے قول و عمل کی توفیق مانگتا ہوں جو جنت کے قریب کر دے' میں جہنم سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور ایسے قول و عمل کی توفیق مانگتا ہوں جس سے جہنم سے بچ جاؤں۔" اب اس تفسیر راجح کے مطابق آیت کا وہ مفہوم ہی نہیں ہے جو ہمارا موضوع بحث ہے۔

پانچویں دلیل

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے ذکر کرنے والوں کو مسجد سے نکال دیا اور

فرمایا، میں تمہیں بدعتی ہی پاتا ہوں۔ [1]

اس کے بھی کئی جواب ہیں۔

۱ یہ اثر (قول صحابی) اگرچہ بہت سارے فقہا نے نقل کیا ہے، مگر حدیث کی کتابوں میں کہیں اس کا وجود نہیں ہے، بلکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف (جواز ذکر جہر) ثابت ہوتا ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے نتیجۃ الفکر میں لکھا ہے کہ اگر یہ اثر ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے تو اس کی سند چاہیے اور یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ حفاظ حدیث میں سے کن حضرات نے یہ اثر اپنی کتابوں میں نقل فرمایا ہے، لیکن میں نے تو وہ دیکھا جو ابن مسعود سے اس اثر کے انکار پر مبنی ہے۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے کتاب الزہد میں نقل فرمایا ہے، ہمیں حسین بن محمد نے اپنی سند کے ذریعے ابو وائل کی یہ حدیث بتائی، انہوں (-ابو وائل) نے فرمایا، یہ لوگ جو گمان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود ذکر جہر سے روکا کرتے تھے (یہ بالکل غلط ہے) میں جب بھی ان کی محفل میں بیٹھا تو انہوں نے ہر محفل میں اللہ کریم کا ذکر (جہر) فرمایا۔

۲ اگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اثر کو صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ صحیح اور صریح احادیث کے خلاف ہوگا جن احادیث سے ایسا ذکر جہر ثابت ہو جو حد سے بڑھا ہوا نہ ہو تو تعارض کی صورت میں وہ احادیث مقدم ہونگی۔ [2]

۳ تیسرا جواب وہی ہے جو بزازی نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔

چھٹی دلیل

بیہقی نے شعب الایمان میں، ابن حبان رضی اللہ عنہ اور امام احمد نے اپنی سند میں

---

[1] اس سے ثابت ہوا کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ذکر جہر کو بدعت سمجھتے تھے۔ مترجم)

[2] یعنی احادیث کے مقابلے میں قول صحابی کو چھوڑ دیا جائے اور عمل احادیث پر ہوگا۔ مترجم)

سعد بن مالک سے مرفوعاً صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ "بہترین ذکر خفی اور بہترین رزق بقدر ضرورت... ہے۔" اس سے پتہ چلا کہ ذکر جہر شر ہے شر یا تو حرام ہوتا ہے یا مکروہ۔ [1]

جواب

یہ حدیث جہر سے ممانعت کی دلیل نہیں، بلکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذکر سری افضل ہے اور اس میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں، ہمارے اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ لفظ خیر دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ صحاح کے مصنف اور دیگر ائمہ لغت یہی کہتے ہیں۔

۱ پہلا استعمال یہ ہے کہ اس سے مراد تفضیل (بہتر ہونا) تو ہو مگر افضلیت (سب سے بہتر ہونا) نہ ہو۔ اس وقت اس کی ضد اور مقابل لفظ شر ہو گا۔

۲ دوسرا استعمال یہ ہے کہ اس سے مراد افضلیت (سب سے بہتر ہونا) ہو۔ اس صورت میں اس کی اصل اخیر ہوگی، پھر ہمزہ (الف) کو تخفیف (لفظ کو ہلکا کرنا) کے لیے حذف کر دیا گیا۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے اس حدیث حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم میری زندگی تمہارے لیے خیر ہے اور میرا وصال تمہارے لیے خیر ہے) کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان دونوں (زندگی اور موت) میں سے ہر ایک دوسرے سے خیر (بہتر) ہو، تو امام سیوطی نے جواب دیا کہ خیر دو معنوں میں مستعمل ہے، تو خیر اس حدیث میں پہلے معنی میں بھی مستعمل ہے، یعنی اس سے مراد صرف تفضیل ہے۔ افضلیت نہیں تو مطلب ہوا کہ حضور علیہ السلام کی ساری حیاتِ طیبہ اور وصال مبارک میں خیر ہی خیر (تفضیل) ہے۔

جب یہ معانی آپ کو سمجھ آ گئے تو ہم کہتے ہیں کہ خیر کا لفظ جو اس حدیث (خیر الذکر الخفی) میں آتا ہے، پہلے معنی تفضیل میں نہیں بلکہ دوسرے معنی (افضلیت) میں ہے تو مطلب یہ ہو گا، کہ ذکر خفی میں زیادہ بہتری ہے اور ذکر جہر میں اس سے کم بہتری ہے، اس کا یہ

---

[1] اب ذکر جہر ان دو باتوں سے خالی نہیں۔ مترجم)

مطلب ہرگز نہیں کہ جہر شر ہے' جیساکہ دلیل دینے والے صاحب سمجھ رہے ہیں' جو معنی ہم کررہے ہیں' وہ اس لیے زیادہ صحیح ہے کہ بے شمار صحیح و صریح احادیث سے ذکر جہر کا ثبوت ملتا ہے جلدی ہی وہ احادیث آپ کے سامنے آرہی ہیں' اس بات کو غور سے سمجھ لیں یہ مفید اور لطیف بات ہے۔ [1]

اب رہی ان لوگوں کی بات جو نفس جہر جائز مانتے ہیں تو ان کے کئی اقوی دلائل ہیں۔

ذکر جہر کے جواز پر دلائل

بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی' ابن ماجہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کریم فرماتا ہے' میرے متعلق میرا بندہ جو گمان کرتا ہے میں اسے پورا کرتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے' اگر مجھے اپنے جی میں ذکر کرتا ہے تو میں اسے اپنے جی میں ذکر کرتا ہوں' اگر مجھے گروہ میں ذکر کرتا ہے تو میں اسے ایسے گروہ میں ذکر کرتا ہوں جو اس کے گروہ سے بہتر ہوتا ہے' اگر میری طرف وہ ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں' اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک باغ (دونوں ہاتھ پھیلانے کی مقدار کلاچ) بڑھتا ہوں' اگر وہ میری طرف چلتے آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑتا آتا ہوں۔"

حافظ عبد العظیم المنذری نے کتاب الترغیب والترهیب میں فرمایا کہ یہ حدیث امام محمد نے صحیح سند سے روایت کی ہے اور آخر میں یہ الفاظ بڑھائے ہیں' قتادہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] یہاں تک علامہ عبد الحی نے ذکر جہر سے روکنے والوں کے دلائل بھی ذکر کیے اور ان کے علمی اور فکر مدلل جوابات بھی ذکر فرمائے جن سے ثابت ہو گیا کہ ذکر جہر سے روکنے کے جتنے دلائل ذکر کیے گئے ہیں ان سے مراد وہ معانی نہیں جو معترضین نے لیے ہیں' بلکہ یا تو ان کے معانی اور ہیں یا وہاں کئی احتمالات ہیں' جن کے ہوتے ہوئے ان حضرات کا استدلال صحیح نہیں ہے' کیونکہ مسلمہ بات ہے جب احتمال آ جائے تو استدلال ختم ہو جاتا ہے۔ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال (مترجم)

اللہ تعالیٰ مغفرت میں جلدی فرمانے والے ہیں۔ [1]

علامہ جزاری نے مفتاح الحصن الحصین میں کہا ہے 'اس حدیث میں ذکر جہر کے جواز کی دلیل ہے اور یہ حدیث ذکر جہر سے روکنے والوں کے خلاف ہے۔ اس حدیث سے معتزلہ نے یہ دلیل لینے کی کوشش کی ہے کہ فرشتے انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں' حالانکہ اس میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں' کیونکہ ذکر کی محافل جمانے والوں میں انبیاء تو شامل نہیں ہوئے۔

امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گروہ اور جماعت میں تو ذکر ہی ہوتا ہے تو حدیث سے جائز ثابت ہوا۔ [2]

۲ امام ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' بزار' بیہقی (شعب الایمان) اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الذکر میں ابن عباس سے مرفوعاً یہ حدیث روایت کی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' اے آدم کے بیٹے! جب تو تنہا مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی تنہا تجھے یاد کرتا ہوں' اور جب تو مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں تجھے ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں' جو ان سے افضل ہوتی ہے اور ان سے مقدار میں بھی زیادہ ہوتی ہے۔

۳ علامہ طبرانی نے حضرت معاذ بن انس سے مرفوع حدیث یوں بیان کی کہ کوئی مجھے جب اکیلا یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اکیلا یاد کرتا ہوں اور جب مجھے گروہ میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اعلیٰ گروہ میں ذکر کرتا ہوں۔ علامہ منذری فرماتے ہیں اس حدیث کی سند حسن ہے۔

۴ امام احمد اور علامہ بیہقی نے الاسماء والصفات میں حضرت انس سے یہ حدیث مرفوعاً روایت کی ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابن آدم! اگر تو مجھے اپنے جی میں ذکر کرتا ہے تو میں

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ کریم کے دوڑ کر آنے سے مراد جلدی بخشش دینا ہے یہ مجازی معنی ہوئے۔ مترجم)

[2] یہ حدیث صحاح ستہ میں سے پانچ حضرات اور ان کے علاوہ دو عظیم محدثین امام احمد اور علامہ بیہقی نے روایت کی' حافظ منزری' علامہ جزری اور علامہ سیوطی جیسے عظیم محدثین و شراح حدیث نے اس سے ذکر جہر کو ثابت فرمایا' تو ملت کے ان دس عظما نے عمل اولیاء پر حدیث پاک سے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ (مترجم) یہ حدیث بھی مذکورہ بالا سات کتب میں موجود ہے۔ مترجم)

تجھے اپنے جی میں ذکر کرتا ہوں اور اگر تو مجھے جماعت میں ذکر کرتا ہے' تو میں تجھے اس سے بہتر جماعت میں ذکر کرتا ہوں اگر تو ایک بالشت میرے قریب آتا ہے' تو میں ایک ہاتھ تیرے قریب آتا ہوں۔

۵ بخاری' مسلم اور بیہقی نے الاسماء والصفات میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً" روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے راستوں میں گھومتے پھرتے اہل ذکر کو تلاش کرتے رہتے ہیں' جب کچھ لوگوں کو ذکر کرتے پا لیتے ہیں تو پکارتے ہیں' اپنی حاجت کی طرف آؤ۔ [1]

سب فرشتے اکٹھے ہو کر اپنے پروں سے ذکر کرنے والوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ آسمان تک وہ پھیلتے جاتے ہیں' جب محفل ختم ہوتی ہے اور وہ بکھر جاتے ہیں تو آسمان کی طرف چڑھتے ہیں۔ اللہ کریم ان سے پوچھتا ہے حالانکہ اللہ کریم کو تو سب کچھ معلوم ہے۔ [2]

تم کہاں سے آئے ہو؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ ہم بندوں کے پاس سے زمین سے آ رہے ہیں' وہ بندے آپ کی تسبیح و تکبیر اور تہلیل کہہ رہے تھے۔ اللہ کریم پوچھتا ہے کہ انہوں نے مجھے دیکھا ہے۔ فرشتے جواب دیتے ہیں دیکھا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' اگر وہ مجھے دیکھ لیں تو' فرشتے عرض کرتے ہیں' اگر وہ آپ کو دیکھ لیں تو بہت زیادہ عبادت کریں۔ آپ کی بہت زیادہ عظمت و تقدس بیان کریں اور کثرت سے تسبیح بیان کریں۔ اللہ کریم فرماتا ہے' وہ کیا مانگ رہے تھے۔ فرشتے جواباً" عرض کرتے ہیں' وہ آپ سے جنت کا سوال کر رہے تھے۔ اللہ کریم پوچھے گا کیا انہوں نے جنت دیکھی ہے۔ فرشتے کہیں گے جی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے' اگر وہ جنت دیکھ لیں تو (پھر کیا کریں گے) فرشتے جواباً" عرض کریں

---

[1] یہ پکار دوسرے فرشتوں کے لیے ہوتی کہ جس کے تم متلاشی ہو' ہم نے پا لی ہے لہٰذا آؤ محفل ذکر میں شامل ہو جاؤ۔ مترجم)

[2] اللہ تعالیٰ اس لیے نہیں پوچھتا کہ اس ذات پاک کو علم نہیں ہوتا' وہ سب کچھ جانتے ہوئے پوچھتا ہے۔ اسی طرح اگر نبی بھی کوئی بات پوچھ لے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی کو پتہ نہیں۔ پتہ ہوتے ہوئے پوچھا جا سکتا ہے۔ مترجم)

گے 'اگر دیکھ لیں تو ان کی خواہش و حرص میں بہت اضافہ ہو جائے اور طلب زیادہ ہو جائے اور رغبت عظیم ہو جائے۔ اللہ کریم پوچھیں گے 'کس سے پناہ چاہ رہے تھے۔ فرشتے عرض کریں گے، جہنم سے 'ارشاد ہو گا کیا انہوں نے جہنم دیکھی ہے۔ فرشتے عرض کریں گے' جی نہیں۔ فرمان ہو گا' اگر وہ اسے دیکھ لیں تو۔ فرشتے عرض کریں گے' اگر دیکھ لیں تو پوری قوت سے اس سے دور بھاگیں۔ اللہ کریم فرمائیں گے' میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں معاف کر دیا ہے' (یہ سن کر) ایک فرشتہ کہے گا' فلاں شخص تو محفل میں شامل نہیں تھا' وہ صرف ایک کام کے لیے آیا تھا۔ (تو پھر اس کی مغفرت کیسے ہو گئی!) اللہ کریم فرشتوں سے فرمائیں گے' یہ وہ لوگ ہیں' جن کی محفل میں بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہتا۔

ایسی ہی ایک حدیث ابن حبان' ترمذی' ابو نعیم (نے حلیہ الاولیا میں) اور امام احمد وغیرہ نے بھی نقل کی ہے۔ [۱]

۶ ابن ابی شیبہ' امام احمد' مسلم ترمذی اور نسائی نے حضرت امیر معاویہ سے روایت بیان کی ہے' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اپنے صحابہ کے ایک حلقہ میں تشریف لائے۔ فرمایا تم کس وجہ سے یہاں بیٹھے ہو! صحابہ نے عرض کیا' اللہ کریم کے ذکر کے لیے بیٹھے ہیں اور اس کی حمد کر رہے ہیں' کہ اس ذات اقدس نے ہمیں اسلام کی ہدایت عطا فرما کر ہم پر احسان فرمایا' سرکار علیہ التسلیم نے فرمایا' اللہ کو گواہ کر کے کہہ رہے ہو کہ تم صرف اسی کے لیے بیٹھے ہو؟ صحابہ نے عرض کی جی حضور! اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ ہم صرف اسی کے لیے بیٹھے ہیں۔ سرکار علیہ السلام نے فرمایا' میں نے اس لیے تم سے قسم لے کر بات نہیں پوچھی کہ تم پر تہمت لگانا مطلوب تھا' بات یہ ہے کہ میرے پاس جبریل آئے اور مجھے بتایا کہ اللہ کریم تمہاری وجہ سے فرشتوں میں ناز فرماتا ہے۔ [۲]

---

[۱] سات محدثین کا تو مصنف نے نام لیا اور مزید فرمایا' کہ ان کے علاوہ باقی محدثین نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے۔ معلوم ہوا اس پر محدثین کا اجماع ہے اور یہ صحیح ہے۔ (مترجم)

[۲] مطلب یہ ہوا کہ یہ ذکر اللہ کریم کو فرشتوں کے ذکر سے بھی بڑھ کر محبوب ہے' لہٰذا تمہارے اس

۷ امام احمد رضی اللہ عنہ 'ابو یعلی' ابن حبان اور بیہقی نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اللہ کریم قیامت کو فرمائیں گے' آج مجمع کو پتہ چل جائے گا کہ آج اہل کرم کون ہیں؟ آپ سے عرض کیا گیا' یا رسول اللہ (سلام اللہ علیک) کون اہل کرم ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا جو ذکر کی مجالس منعقد کرتے ہیں۔ [۱]

۸ امام احمد نے حضرت انس رضی اللہ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا' کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جب کسی صحابی کو ملتے تو فرماتے' آؤ ایک ساعت کے لیے اپنے رب کریم پر ایمان تازہ کرلیں۔ ایک دن جب یہی بات انہوں نے ایک آدمی سے

ذکر پر اللہ کریم کو ناز ہے۔ مجرد وجودوں کے ذکر سے مرکب وجودوں کا ذکر آگے بڑھ گیا ہے' حالانکہ علائق مرکب وجودوں کو ذکر سے روکتے ہیں' جو ان رکاوٹوں کو پھلانگ جاتا ہے' وہ یقیناً ان سے عظیم ہے جن کے راستے میں رکاوٹیں نہیں۔ یہ بھی بات یاد رہے کہ صحابہ کرام یہاں حلقے میں تھے' اگر ذکر کے حلقے ممنوع' حرام یا مکروہ ہوتے تو سید کل علیہ السلام انہیں روک دیتے' روکا نہیں اور جبریل کی زبان سے پیغام ربانی مل گیا کہ ان حلقوں کے ذریعے تو اللہ کریم فرشتوں پر ناز فرماتے ہیں' ہم سمجھتے ہیں کہ اس حدیث پاک نے تو سارا مسئلہ ہی صاف کر دیا' لطف کی بات یہ ہے کہ اسے بھی پانچ محدثین روایت کرتے ہیں' جن میں سے ایک متواتر کے چار اماموں میں سے ایک ہیں' یعنی امام احمد اور تین صحاح ستہ والے ہیں' مسلم' ترمذی اور نسائی اور ایک شہرہ آفاق محدث ہیں' ابن ابی شیبہ' اب فرمائیے' حدیث ضعیف تو نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر اس پر عمل کیا ہو گا؟ یہی تو عمل صحابہ ہے جن کا عمل معیار حق ہے کیا وہ آیات و احادیث انہیں معلوم نہیں تھیں' جو ذکر جہر سے روکنے والے حضرات ذکر فرماتے نہیں تھکتے؟ اگر معلوم تھیں تو اتنے صحابہ کا عمل خلاف قرآن ہو گا اور وہ بھی سید کل علیہ السلام کی موجودگی میں' استغفر اللہ' معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے ہاں آیت کا وہ مفہوم ہی نہیں تھا جو یہ حضرات سمجھ رہے ہیں۔

---

[۱] فرماتے اب بھی ذکر جہر کے جواز میں کوئی کمی رہ گئی ہے میدان محشر میں خود ذات ربانی فرما رہی ہے کہ آج سارے مجمع کو پتہ چل جائے گا کہ اہل کرم کون ہیں؟ اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اہل کرم کی خود نشان دہی فرما رہے ہیں۔

کہی تو وہ غصے میں آگیا اور حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا حضور! آپ نے ملاحظہ فرمایا' عبداللہ بن رواحہ آپ کے اوپر دائمی ایمان سے ہٹ کر ایک ساعت کا ایمان تلاش کرتا ہے۔ سرکار علیہ السلام نے فرمایا' اللہ کریم رواحہ کے بیٹے پر رحم کرے یہ تو مجالس پسند کرتا ہے۔ جن سے فرشتوں پر ناز کیا جاتا ہے۔ علامہ منذری نے "الترغیب والترہیب" میں فرمایا' اس کی سند حسن ہے۔

۹ ابو یعلی۔ بزار اور طبرانی رضی اللہ عنہ نے حضرت انس سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جو لوگ صرف ذات ربانی کی رضا کے لیے اکٹھے بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ انہیں آسمان سے پکارنے والا پکارتا ہے۔ اٹھو تم سب کی مغفرت ہو گئی ہے۔ تمہاری بدیاں نیکیوں سے بدل گئی ہیں۔ منذری کہتے ہیں' امام احمد نے بھی یہ حدیث ایسے راویوں سے بیان کی ہے۔ جنہیں صحیح حدیث کے لیے حجت جانا جاتا ہے' ہاں ان کے راویوں میں میمون ہیں۔ جنہیں ایک جماعت ثقہ مانتی ہے' مگر ان میں ضعیف ہے۔

۱۰ طبرانی نے سہل بن حنظلیہ سے روایت کیا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جو لوگ بھی مجلس لگا کر اللہ کریم کا ذکر کرتے ہیں' جونہی وہ اٹھتے ہیں' تو انہیں کہا جاتا ہے اس حال میں اٹھو تمہیں اللہ کریم نے بخش دیا ہے۔

۱۱ امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن مغفل سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم علیہ السلام نے فرمایا' جو لوگ بھی جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے بیٹھتے ہیں' انہیں آسمان سے پکارنے والا پکارتا ہے۔ تم اب اس حال میں اٹھو کہ تمہیں مغفرت مل گئی ہے۔

۱۲ احمد' مسلم' ترمذی' ابن ماجہ' ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ان دونوں حضرات نے یہ شہادت دی کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا' جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے اکٹھے بیٹھتے ہیں انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں۔ رحمت ان پر چھا جاتی ہے' اور سکون و طمانیت ان پر نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقربین میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔

۱۳ انہی دونوں (ابوہریرہ و ابوسعید) سے مرفوعاً محدث ابن ابی الدنیا نے یہ روایت لی

ہے کہ اہل ذکر کو چار چیزیں ملتی ہیں 'ان پر سکون نازل ہوتا ہے' رحمت ان پر چھا جاتی ہے' فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ کریم اپنے گروہ والوں میں ان کا ذکر کرتا ہے۔

۱۴ عبد ابن حمید (اپنی سند میں) اور حاکم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیِ مکرم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کریم کے کچھ چلنے پھرنے والے فرشتے ہیں' جو زمین میں ذکر کی مجلسوں میں اترتے اور ٹھہرتے ہیں۔

۱۵ امام احمد اور ترمذی (ترمذی نے اس حدیث کو حسن بھی کہا ہے) نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا' جب جنت کے باغوں سے گزرو تو کچھ کھا لیا کرو۔ لوگوں نے عرض کی' حضور! جنت کے باغ کیا ہیں؟ سرکار نے فرمایا یہ ذکر کے حلقے ہیں۔ علامہ جزری حصن حصین کی شرح مفتاح میں کہتے ہیں کہ سرکار علیہ السلام نے باغوں سے مراد ذکر لیا اور ان محفلوں میں شرکت کو چرنے سے تعبیر فرمایا۔ [۱]

۱۶ ابن نجار نے مرفوعاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اس روایت کو امام سیوطی نے اپنی کتاب "الحبائک فی احوال الملائک" میں نقل کیا ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے کچھ چلتے پھرتے فرشتے ہیں' وہ ذکر کے حلقوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب ایسے حلقوں کے پاس سے گزرتے ہیں' تو ایک دوسرے سے کہتے ہیں' ذرا بیٹھ جاؤ' جب ذکر والے دعا کرتے ہیں تو وہ ان کی دعا پر آمین کہتے ہیں۔ جب وہ نبی علیہ السلام پر درود بھیجتے ہیں تو وہ بھی درود بھیجتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب فارغ ہو جاتے ہیں' پھر فرشتے ایک دوسرے سے کہتے ہیں ان سب ذکر والوں کے لیے خوشخبری ہے' یہ سب بخشے گئے ہیں۔ [۲]

۱۔ کتنی پیاری بات ہے کہ ذکر کے حلقے جنت کے باغ ہیں اور ان حلقوں میں ذکر کرنا جنت کا پھل کھانا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اہل ذکر اسی دنیا میں جنت کا پھل کھا رہے ہیں اور آخرت کی زندگی سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ مترجم)

۲۔ ہمارا خیال ہے کہ اس حدیث پر خصوصاً ان حضرات کو توجہ دینی چاہیے جو رات دن ذکر کی محفلوں

۱۷ محدث بزار نے مرفوعاً حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے گھومتے رہتے ہیں، وہ ذکر کے راستے تلاش کرتے ہیں۔ جب ایسے حلقوں میں پہنچ جاتے ہیں تو انہیں گھیر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں 'اے ہمارے پروردگار ہم تیرے ایسے بندوں کے پاس آئے ہیں جو تیری نعمتوں کو عظیم جانتے ہیں، تیری کتاب پڑھتے ہیں اور تیرے نبی پر درود بھیجتے ہیں، اور تجھے اپنی آخرت اور اپنی دنیا کے لیے سوال کرتے ہیں۔ انہیں اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ان ذکر کرنے والوں کو میری رحمت سے ڈھانپ دو، یہ وہ ہم مجلس ہیں کہ جن کے شریک محفل بدبخت نہیں ہوتے۔

۱۸ امام احمد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے سرکار علیہ السلام سے عرض کیا، یا رسول اللہ! مجالس ذکر کی غنیمت کیا ہے؟ سرکار علیہ السلام نے فرمایا، (اس کی غنیمت) جنت ہے۔ علامہ منذری فرماتے ہیں کہ امام احد نے بھی اسے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ [۱]

۱۹ ابو یعلی، حاکم (حاکم نے اس حدیث کو صحیح بھی قرار دیا ہے) اور دعوات بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ السلام ہمارے طرف تشریف لائے اور فرمایا اے لوگو! اللہ کریم کے کچھ چلتے پھرتے فرشتے ہیں وہ مجالس ذکر میں اترتے اور وہاں ٹھہرتے ہیں، تو تم بھی جنت کے باغوں سے کھالیا کرو۔ لوگوں نے عرض کیا، حضور!

اور درود و سلام کے خلاف حرام و بدعت کی گردانیں کرتے رہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کے جائز ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ اس لیے بدعت ہے کہ یہ اب یجاد ہوا۔ فرمائیے حضرت ابو ہریرہ ابن النجار اور امام سیوطی بھی ان حضرات کے ساتھ اب ایجاد ہوئے ہیں۔ ساری امت دور صحابہ سے حسب فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک (جماعت) عمل کرتی آرہی ہے، اور یہ حضرات آج فرما رہے ہیں کہ اس کا وجود نہیں ہے، ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات کا اپنا علمی وجود نہیں ہے۔ مترجم)

[۱] ابن عمر نے ذکر کو جہاد کے ساتھ تشبیہ دی، چونکہ جہاد کے بعد مال غنیمت ملتا ہے تو انہوں نے حضور سے پوچھا، پھر ذکر کے جہاد کے بعد مال غنیمت کیا ہوگا، ارشاد ہوا ذکر کا مال غنیمت جنت ہے، کہیں ذکر سے روکنے والے حضرات نے یہ ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا کہ امت محمدیہ کو جنت سے محروم رکھنا ہے۔ مترجم)

جنت کے باغ کیا ہیں؟ ارشاد فرمایا ذکر کی مجلسیں اللہ کے ذکر میں صبح و شام کرو۔ منذری فرماتے ہیں ابن ابی الدنیا وغیرہ نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ ان سب حضرات کی اسناد میں عفرہ کا آزاد کردہ غلام (مولیٰ) عمر بن عبد اللہ آتا ہے۔ اور اسے نسائی اور ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام احمد نے اسے قابل اعتبار قرار دیتے ہوئے نہ پایا (لاباس بہ) اس میں کوئی حرج نہیں۔ باقی سارے راوی معتبر اور قابل حجت ہیں اور یہ حدیث حسن ہے۔ [1]

۲۰ طبرانی نے صغیر میں سند حسن سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت لی ہے کہ نبی پاک علیہ السلام نے فرمایا، تم ہی تو وہ گروہ ہو جس کے متعلق اللہ کریم نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی ذات کو تمہارے پاس روکے رکھوں، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "محبوب! اپنے آپ کو ان کے ساتھ روکے رکھئے، جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔" جو بھی تمہارے ساتھ بیٹھا اس کے ساتھ فرشتے بیٹھ گئے، اگر یہ لوگ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، تو فرشتے بھی تسبیح کرتے ہیں، اگر یہ اللہ کی حمد کرتے ہیں، تو فرشتے بھی اللہ کی حمد کرتے ہیں، وہ فرشتے پھر بھی اللہ کریم کی طرف جاتے ہیں۔ اللہ کریم ان سب باتوں کو جانتا ہے، مگر وہ پھر بھی دربار ربانی میں عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ کے بندے آپ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں، آپ تو پاک ہیں، وہ آپ کی حمد بیان کرتے ہیں تو ہم بھی آپ کی حمد بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، اے میرے فرشتو! میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں میں نے انہیں بخش دیا ہے فرشتے کہیں گے، ان میں تو فلاں اور فلاں بھی ہیں۔ (یعنی وہ تو بخشش کے لائق نہیں ہیں) تو اللہ کریم ارشاد فرمائیں گے۔ (سب مغفور ہیں کہ یہ اہل ذکر) ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ہم مجلس بد بخت نہیں ہوتے۔

۲۱ طبرانی نے حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ کریم کے دائیں (حالانکہ اللہ کے

---

[1] ہم سمجھتے ہیں کہ امام احمد کی بات صحیح ہے۔ راوی معتبر ہے، کیونکہ اس کی تائید لاتعداد روایات سے ہو رہی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ اگر ضعیف حدیث یا ضعیف راوی کی تائید میں دوسری قوی حدیث یا دوسرا قوی راوی آ جائے تو وہ حدیث اور وہ راوی معتبر ٹھہرتے ہیں۔ مترجم)

دونوں دائیں ہیں) کچھ مرد ہیں' وہ نہ تو انبیاء ہیں اور نہ ہی شہدا ہیں ۔ ان کے چہروں کی دمک سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ نبیوں اور شہیدوں کو بھی اس بات پر رشک آتا ہے کہ ان کی نشست گاہیں اللہ کریم کے کتنی قریب ہیں اور ان کو قرب کا کتنا بلند مرتبہ حاصل ہے۔ سید دارین علیہ السلام سے عرض کیا گیا حضور! یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا وہ مختلف قبیلوں کا مجموعہ ہیں' جو ذکر ربانی کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور پاکیزہ اور نفیس کلام ذکر ربانی کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ جیسے کھجوریں کھانے والا اچھی کھجوریں چن چن کا کھاتا ہے۔ منذری فرماتے ہیں اس کی سند قریباً صحیح ہے۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ (حدیث میں جو لفظ جماع۔ ج پر پیش اور میم پر شد۔ آیا ہے اس کا مطلب ہے۔ مختلف قبائل اور مختلف جگہوں کے ملے جلے لوگ)

نوازع نازعہ کی جمع ہے۔ اس کا معنی اجنبی ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی باہمی قرابت داری ہے یا وہ ہم نسب ہیں' یا ایک دوسرے سے جان پہچان ہے' وہ تو صرف اللہ کے ذکر کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ [1]

۲۲ طبرانی نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' اور منذری نے ان کی سند کو حسن کہا ہے' کہ نبی رحمت علیہ السلام نے فرمایا' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو اس حال میں اٹھائے گا کہ ان کے چہرے نورانی ہونگے اور وہ موتیوں کے منبروں پر ہوں گے۔ لوگ ان پر رشک کریں گے' حالانکہ وہ نبی ہیں اور نہ شہید۔ ابو الدرداء فرماتے

---

[1] ایسی محفلیں صرف اولیائے امت کی ہوتی ہیں' جن میں لوگ صرف ذکر خداوندی کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں ان میں نسبی تعلق نہیں ہوتا' رشتہ داری نہیں ہوتی۔ سوائے مرشد کے تعلق کے باہمی جان پہچان نہیں ہوتی' لہٰذا حدیث پاک پر عمل کرنے کے لیے یہ انداز جاری رہنا چاہیے' ورنہ بات وہی ہوگی۔

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

ایسی محافل کو کوئی بدعتی ہی بدعت کہہ سکتا ہے۔ یہ محفلیں تو صحابہ کرام سجا کر سرور دو عالم سے داد وصول کرتے رہیں' انہیں روکنا کوئی بید رد ہی اپنا سکتا ہے۔ مترجم)

ہیں کہ (یہ سن کر) ایک بدوی (محفل میں) گھٹنوں پر کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ! ان کے وصف بیان فرمائیں تاکہ ہم انہیں پہچان سکیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' وہ محض اللہ کریم کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں' وہ مختلف قبیلوں اور مختلف شہروں کے ہیں' جو اللہ کریم کے ذکر کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ [۱]

۲۳ امام حاکم' بیہقی (شعب الایمان) ابن حبان' امام احمد' علی اور ابن السنی رحمہم اللہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' ذکر خدا اس کثرت سے کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ سمجھیں۔ [۲]

۲۴ طبرانی نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمائی ہے کہ سید کل علیہ السلام نے فرمایا' اللہ تعالٰی کا اس طرح ذکر کرو کہ منافق کہیں تم دکھلاوے کے لیے کر رہے ہو۔ امام سیوطی رحمہ اللہ اپنی کتاب "نتیجۃ الفکر فی الجہر بالذکر" میں فرماتے ہیں کہ ان دو حدیثوں (نمبر ۲۳۔ ۲۴) سے استدلال اس وجہ سے ہے کہ یہ بات اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب ذکر جہر ہو ذکر سر نہ ہو۔

۲۵ بقی بن مخلد نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ سے یہ مرفوعاً روایت کیا ہے' کہ حضور علیہ السلام دو مجلسوں کے پاس سے گزرے ایک مجلس والے تو اللہ کو پکار رہے تھے اور اس کی رغبت دلا رہے تھے اور دوسری محفل والے علم پڑھ پڑھا رہے تھے۔ سرکار علیہ

---

[۱] حضرات پہچانئے یہ تو اولیاء کرام کے ہی مرید ہیں' جن کی باہمی محبت صرف اللہ کے لیے ہوتی مختلف جگہوں اور مختلف قبیلوں سے آتے ہیں' ان کا رشتہ پیر بھائی کا ہوتا ہے۔ مترجم)

[۲] اس ذکر میں دو باتوں کا ہونا ضروری ہے یہ جہری ہو تاکہ لوگ سنیں۔ بہت کثرت اور خود فراموشی سے ہو کہ ذاکر کو اپنا وجود بھی یاد نہ رہے اور تسلسل رکھنا کہ دنیادار دیکھ کر دنگ رہ جائے اور بے ساختہ اس کی زبان پر آئے' بھائی یہ لوگ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ ذکر کی ایسی محافل اولیاء امت میں عموماً اور اولیاء نقشبند میں خصوصاً منعقد ہوتی ہیں' اگر شوق ہو تو ایسے درباروں میں جا کر ان حضرات کے ذوق کو چشم سر سے دیکھو' اس حدیث پاک کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ یہ حدیث بھی چھ معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ اسے وہی غیر معتبر کہہ سکتا ہے کہ جس کے ہاتھ پر غیر معتبر ہونے کی مہر لگ چکی ہو گی۔ مترجم)

السلام نے فرمایا' دونوں مجلسیں سراپا خیر اور نیکی ہیں' مگر ایک محفل دوسری سے افضل ہے۔ [1]

۲۷ امام ابن مبارک' سعید بن منصور' ابن ابی شیبہ' امام احمد (زہد میں) ابن ابی حاتم ابو الشیخ (کتاب العظمۃ میں) طبرانی (کبیر میں) اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ پہاڑ دوسرے پہاڑ کو اس کا نام لے کر کہتا ہے کہ کیا تجھ پر سے آج کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے؟ اگر وہ جواب دے کہ ہاں (گزرا ہے) تو وہ بہت خوش ہوتا ہے' پھر عبداللہ ابن عباس رضی اللہ نے یہ آیت پڑھی "تم تو ایک منکر چیز لائے ہو اس سے تو قریب ہے کہ پہاڑ بھی پھٹ جائیں۔"

۲۸ محدث ابو الشیخ نے اپنی کتاب العظمۃ میں حضرت محمد بن منکدر سے روایت کیا ہے کہ صبح دو پہاڑوں میں سے ایک دوسرے سے پوچھتا ہے' اس کا نام لے کر کہتا ہے کہ اے فلاں کیا تجھ پر سے آج کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے؟ دوسرا پہاڑ کہتا ہے' جی ہاں (گزرا ہے) تو پہلا پہاڑ کہتا ہے' اللہ کریم نے تیری آنکھیں تو ٹھنڈی کر دیں آج مجھ پر سے تو کوئی ذاکر نہیں گزرا۔ [2]

۲۹ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت (ان پر آسمان اور زمین نہ روئے) کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مومن جب مرتا ہے تو زمین کا وہ حصہ جس پر وہ نماز پڑھتا تھا' اور ذکر کیا کرتا تھا اس پر روتا ہے' ابن جریر نے اپنی تفسیر میں یہ حدیث نقل کی۔

۳۰ محدث ابن ابی الدنیا نے سلیمان بن عبدالملک کے ساتھی ابو عبید سے یہ روایت

---

[1] اہل علم نے محفل تعلیم و تعلم کو افضل قرار دیا' کیونکہ سرکار علیہ السلام دوسری روایت کے مطابق اس میں تشریف فرما ہوئے اور ارشاد ہوا "انما بعثت معلما" (مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ مترجم)

[2] پتہ چلا کہ ذکر جہر سے غیر جاندار بھی لطف اندوز ہوتے ہیں' پھر جان اور ایمان رکھنے والے بھلا اس ذکر کو کیسے حرام اور بدعت و مکروہ کہہ سکتے ہیں۔ مترجم)

نقل کی ہے کہ مومن بندہ جب مرتا ہے تو زمین کے مختلف خطے پکارتے ہیں' اللہ کا مومن بندہ مر گیا تو اس پر زمین و آسمان رونے لگ جاتے ہیں۔ رحمان جل جلالہ' ان دونوں سے پوچھتے ہیں کہ کیوں روتے ہو؟ تو دونوں عرض کرتے ہیں' اے ہمارے پروردگار اس لیے رو رہے ہیں کہ وہ ہمارے جس گوشہ میں بھی چلتا تھا' آپ کا ذکر ہی کرتا رہتا تھا۔ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ زمین و آسمان کا رونا اسی وجہ سے تھا کہ وہ ذکر جہر کرتا تھا۔

۳۱ امام بیہقی نے زید بن اسلم سے وہ ایک صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک رات نبی پاک علیہ علیہ السلام کے ساتھ چل رہا تھا' حضور علیہ السلام مسجد میں ایک شخص کے پاس سے گزرے' جو بلند آواز سے ذکر کر رہا تھا' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہو سکتا ہے کہ یہ ریا کر رہا ہو' آپ نے فرمایا' ریا کار نہیں' دربار خداوندی میں زاری کرنے والا ہے۔

۳۲۔ امام بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص اپنی آواز ذکر کرتے ہوئے بلند کیا کرتا تھا' ایک شخص نے اسے کہا آواز کو پست رکھیں' سرکار علیہ السلام نے فرمایا' اسے اپنے حال پر رہنے دیں یہ عاجزی کرنے والا ہے۔

امام بیہقی نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' ایک شخص جس کا نام ذوالبجادین تھا' اسے سرکار علیہ السلام نے اواہ (آہ و زاری کرنے والا) فرمایا' اور یہ اس لیے کہ وہ اللہ کریم کا ذکر کرتا تھا۔ [1]

۳۴۔ امام حاکم نے حضرت شداد بن اوس سے روایت لی کہ ہم محفل مصطفے علیہ السلام میں بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا' اپنے ہاتھ اٹھاؤ اور لا الہ الا اللہ کہو' ہم نے حکم کی تعمیل

---

[1] ان تینوں حدیثوں سے پتہ چلا کہ محبت کی آگ دل میں جلتی ہے تو زبان سے بلند ذکر اور آہ زاری کی آواز بلند ہوتی ہے اور یہ اضطراری امر ہوتا ہے۔ یہ آواز رک نہیں سکتی' اگر جبر سے روکیں تو..... شراب محبت کے اس ذوق کا کھوکھلے دلوں کو پتہ نہیں ہوتا' سرکار علیہ السلام جو دلوں کے ڈاکٹر ہیں یہی بات ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ مستانوں کو نہ روکو۔ مترجم)

کی، تو نبی علیہ السلام نے عرض کی 'اے اللہ! آپ نے مجھے یہ کلمات عطا فرما کر بھیجا ہے' اور مجھے ان کا حکم دیا ہے اور ان کے پڑھنے پر مجھ سے وعدہ فرمایا ہے' یقیناً آپ وعدہ خلافی نہیں فرماتے۔ [1]

۳۵ - ابن جریر اور طبرانی نے حضرت عبدالرحمان بن سہل سے نقل کیا ہے، جب یہ آیت نازل ہوئی "اپنے جی کو ان لوگوں کے ساتھ رکھئے جو اپنے رب کریم کو پکارتے ہیں۔" تو آپ اپنے کسی گھر میں تشریف فرما تھے' آپ گھر سے باہر تشریف لائے تو کچھ لوگوں کو ذکر کرتے پایا' آپ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور فرمایا کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں' س نے میرا معاملہ یوں بنایا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ [2]

۳۶ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے کتاب الزھد میں نقل فرمایا ہے' ثابت فرماتے ہیں کہ حضرت سلمان ایک گروہ میں تھے اور سب ذکر کر رہے تھے کہ نبی رحمت علیہ السلام کا وہاں سے گزر ہوا تو وہ خاموش ہو گئے۔ سرکار علیہ التسلیم نے فرمایا میں نے دیکھا کہ تم پر رحمت نازل ہو رہی ہے' تو میں نے چاہا کہ تمہاری محفل میں شریک ہو جاؤں۔

۳۷ - امام اصبہانی نے کتاب الترغیب والترھیب میں ابو رزین عقیلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تجھے وہ نہ بتاؤں جس پر سارے معاملے کا مدار ہے' عرض کیا گیا حضور فرمائیں' ارشاد ہوا مجالس ذکر کو اپنے لیے لازم سمجھ لے اور جب تنہا ہو تو اپنی زبان کو اللہ کے ذکر سے حرکت دیا کر۔ [3]

۳۸ - امام بیہقی اور اصبہانی نے مرفوعاً حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اگر میں لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک ذکر کی محافل میں بیٹھ جاؤں تو مجھے ان سب چیزوں سے عزیز ہے' جن پر سورج نکلتا ہے (مراد ساری دینا ہے) اسی طرح اگر نماز عصر کے بعد لوگوں کے ساتھ سورج ڈوبنے تک ذکر کی محفل میں بیٹھ جاؤں تو مجھے ساری

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جو حضرات اس پر ایمان لاتے ہیں' ان کی بخشش کا وعدہ ہے تو اسے پورا فرمائیں۔ مترجم)

[2] ثابت ہوا کہ دور نبوی میں ذکر کے حلقے ہوتے تھے' صحابہ کرام ذکر کے لیے اکٹھے ہوتے تھے اور کبھی سرکار عرش وقار علیہ السلام ان کی محفلوں کو منور فرمانے آجاتے تھے۔ مترجم)

[3] کتنی واضح حدیث ہے۔ محافل ذکر کی تلاش میں رہو اور مل کر ذکر کرو۔ مترجم)

دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سے بڑھ کر محبوب ہے۔ [۱]

۳۹۔ امام ابو داؤد اور ابو علی نے حضرت انس سے مرفوعاً یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ اگر میں اللہ کریم کا ذکر کرنے والوں میں (نماز صبح کے بعد) سورج نکلنے تک بیٹھ جاؤں، تو میرے لیے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے چار غلاموں کو آزاد کروں، اسی طرح اگر بعد نماز عصر میں غروب شمس تک اہل ذکر کی محفل میں بیٹھ جاؤں تو چار اسمعیلی آزاد کرنے سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ [۲]

۴۰۔ بخاری و مسلم نے اپنی سندوں سے حضرت انس سے روایت کیا ہے، عمرو بن دینار سے مروی ہے کہ مجھے ابو معبد نے حضرت ابن عباس کے بہت سچے آزاد کرد غلام سے یہ حدیث بیان کی کہ ان (غلام) کے مولیٰ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، جب لوگ فرض نماز سے پلٹتے (فارغ ہوتے) تو عہد نبوی میں بلند آواز سے وہ ذکر کیا کرتے تھے۔ مذکورہ سند کے ساتھ دونوں حضرات، بخاری و مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ تکبیر کی بلند آواز سے میں سمجھ جاتا کہ نبی علیہ السلام کی نماز پوری ہو گئی ہے۔ [۳]

سوال

مسلم کی سند میں آتا ہے کہ عمرو بن دینار نے کہا، مجھے یہ حدیث ابو معبد نے بتائی تھی، پھر انہوں نے اس بات کا انکار کر دیا اور قاعدہ یہ ہے کہ جب اصل (اوپر والے کی روایت کرنے والا نیچے والا فرع) راوی کی روایت کا انکار کرے یا اس کی تکذیب کر دے تو اس روایت کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ [۴]

---

[۱] اس حدیث سے اوقات ذکر کی بھی ایک حد تک تعیین ہو گئی۔ مترجم)

[۲] اولاد اسماعیل علیہ السلام کی تخصیص اس لیے کہ وہ عربوں میں محترم و معزز تھے۔

[۳] یعنی جماعت ختم ہونے کا پتہ چل جاتا تھا، کیونکہ نماز کے ختم ہونے پر صحابہ رضی اللہ عنہم بلند آواز سے ذکر فرماتے اور تکبیر کہتے، جو ذکر ربانی ہے۔ مترجم)

[۴] مطلب یہ ہے کہ ابو معبد کے لیے عمرو بن دینار فرع ہیں۔ اصل (ابو معبد نے جب کہہ دیا کہ میں نے تمہیں یہ حدیث نہیں بتائی تو اس حدیث سے اعتبار اٹھ گیا۔ مترجم)

جواب

یہ سوال اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ہم کہتے ہیں۔ محدثین کے نزدیک یہ مسئلہ مشہور اور اس کی تفاصیل یوں ہیں' کیا اصل تکذیب میں پختہ ہے یا نہیں؟ اگر پوری طرح تکذیب کرتا ہے تو اس کی تصریح کرتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ تکذیب سختی سے نہیں کرتا مثلاً کہتا ہے مجھے یہ یاد نہیں ہے تو اب محدثین ایسی حدیث کو قبول کرتے ہیں اور اگر وہ پوری شدت سے صراحتہ۔ تکذیب کرتا ہے تو اب محدثین اس حدیث کو رد کر دیتے ہیں' اگر تکذیب تو کی ہے' مگر اس کی وضاحت نہیں کی تو ایسی حدیث کے رد و قبول میں اختلاف ہے۔ مندرجہ حدیث اسی گروہ سے متعلق ہے' کیونکہ اس روایت میں ابو معبد نے کہا ہے میں نے تمہیں یہ حدیث نہیں بتائی۔ ابن صلاح" نے خطیب" کی پیروی کرتے ہوئے ایسی حدیث کو رد کیا ہے' وہ مقدمہ اصول حدیث میں فرماتے ہیں کہ جب ثقہ (معتبر راوی) ثقہ سے روایت کرے' پھر مروی عنہ (جس سے روایت نقل کی گئی ہے۔ جیسے اوروں نے اصل کہا ہے۔ مترجم) نے رجوع کر لیا تو مختار بات یہ ہے اگر اس نفی میں اس نے پختگی ظاہر کی مثلاً کہہ دیا کہ میں نے یہ روایت نہیں کی یا کہے کہ تو نے مجھ پر جھوٹ باندھا وغیرہ۔ اب یہ بات روایت کی پختگی کے خلاف چلی گئی تو حدیث کا پتہ نہ رہا جب حدیث کے متعلق بے خبری (جہل) ثابت ہو گئی تو اس فرع کی حدیث رد کر دی جائے گی' لیکن یہ اس کے لیے جرح نہیں ہے' کیونکہ یہ استاذ نے اسے جھٹلا دیا ہے' تو دونوں میں تعارض آجائے گا۔[1]

ہاں اگر مروی عنہ کہتے ہیں کہ میں نہیں پہچانتا یا مجھے یاد نہیں ہے' وغیرہ تو ایسی حدیث سب محدثین' فقہا اور متکلمین کے نزدیک ساقط نہیں ہوتی' کچھ حنفی حضرات ایسی حدیث کو ساقط الاعتبار قرار دیتے ہیں۔ ان کا استدلال وہ حدیث ہے' جو سلیمان بن موسیٰ

---

[1] مطلب یہ ہوا کہ اصل نے فرع کو جھٹلا دیا تو ان دونوں میں تعارض آگیا۔ تعارض کی صورت میں حدیث ساقط ہو گئی' کیونکہ وہ معلوم ہی نہ رہی تو اصل کا اصل جہل (نا معلوم ہونا) قرار پایا' لہٰذا اس پر عمل ختم ہوا۔ مترجم)

نے زہری سے روایت کی ہے۔ زہری عروہ سے روایت کرتے ہیں اور عروہ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا "جب عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے تو اس کا نکاح باطل ہے۔" اس روایت میں ابن جریج ہیں فرماتے ہیں، جب میں زہری سے ملا اور اس کے بارے میں پوچھا تو زہری نے فرمایا کہ میں اسے نہیں پہچانتا، مگر صحیح وہی ہے، جو جمہور کا مسلک ہے کہ ایسی حدیث مقبول ہے۔ ابن صلاح نے دونوں صورتوں کو برابر قرار دیا۔ جب صراحۃ تکذیب کرتے ہوئے کہا ہو کہ اس نے مجھ پر جھوٹ باندھا، یا تصریح نہ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ میں نے یہ روایت نہیں کی ہے۔ اسی کی پیروی حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے شرح النخبہ میں کی، لیکن فتح الباری میں انہوں نے کہا کہ محدثین کے نزدیک (دوسری صورت میں جب کہا ہو کہ میں نے روایت نہیں کی) قبولیت راجح ہے، انہوں نے امام مسلم کے استدلال کو مانا اور اسی قول سے تمسک کیا، امام مسلم نے عمرو بن دینار کی مذکورہ حدیث لی اور ابو معبد کا یہ قول بھی نقل کیا کہ میں نے تمہیں یہ حدیث نہیں بتائی۔ اس کے باوجود اس حدیث کا لینا دلیل ہے کہ مسلم ایسی حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں۔ امام نووی نے مسلم کی شرح میں فرمایا، امام مسلم کا اس حدیث سے حجت لینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایسی حدیث کو صحیح مانتے ہیں جو اس انداز سے روایت ہوئی ہو کہ محدث خود اس کا انکار کر رہا ہو، بشرطیکہ اگلا راوی (فرع) کا ثقہ ہو۔ جمہور علماء، محدثین، فقہا اور ماہرین اصول --- کا یہی مذہب ہے، سب فرماتے ہیں کہ ایسی حدیث حجت ہے جب شیخ (اصل) بوجہ شک یا نسیان کے انکار حدیث کر رہا ہو یا یوں کہہ رہا ہو کہ مجھے یاد نہیں ہے ہاں احناف میں سے امام کرخی نے ایسی حدیث کو حجت نہیں مانا۔ اس ساری تحقیق سے ظاہر ہو گیا کہ ایسی حدیث کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں بھلا ایسی حدیث کیوں نہ مانی جائے، جبکہ بخاری و مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں نقل کیا ہے ہمارے لیے ان کی پیروی کافی ہے۔ [۱]

---

[۱] یہاں تک مصنف نے یہ ثابت کیا کہ حدیث نمبر ۴ متروک نہیں ہے۔ قابل عمل ہے، کیونکہ اس کے ایک راوی کے متعلق اس کے استاذ کے الفاظ اس کے خلاف جرح نہیں ہیں، بلکہ استاذ کو بات یاد نہیں ہے۔ شاگرد ثقہ ہے، لہذا بلاوجہ اسے غیر ثقہ قرار دے کر اس کی حدیث کو رد نہیں کیا جا سکتا اور جب بھی اصل (استاذ) کہے کہ مجھے یاد نہیں یا میں نے یہ حدیث بیان نہیں کی یا اسی قسم کے اور الفاظ ہوں تو ان سے فرع (شاگرد) غیر ثقہ نہیں ہو جاتا، کیونکہ اس کی ثقاہت مسلمہ ہے، یہی جمہور علمائے اسلام کا نظریہ ہے۔ صرف چند حضرات اسے تسلیم نہیں کرتے۔ مترجم)

ایک اور سوال

اگر آپ یہ سوال کر دیں کہ اگرچہ اس حدیث سے ذکر جہر ثابت ہوتا ہے، لیکن جمہور فقہائے احناف اور جمہور فقہائے شافعیہ کے نزدیک معمول بہ نہیں ہے، وہ سب کہتے ہیں کہ نماز کے بعد ذکر جہر مسنون نہیں، بلکہ ذکر سری مسنون ہے نصاب الاحتساب میں ہے اگر نماز کے بعد جہراً تکبیر کہیں گے تو یہ بدعت ہوگی اور مکروہ ہے یہ تکبیر بلند آواز سے صرف قربانی اور ایام تشریق میں ہی ہو سکتی ہے۔ [1]

ابن ابطال وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ ارباب مذاہب متفق ہیں کہ ذکر بلند آواز سے نماز کے بعد کرنا مستحب نہیں ہے۔ امام شافعی نے حدیث کو اس معنی پر محمول فرمایا ہے کہ یہ جہر مختصر سے وقت کے لیے تھا، ہمیشہ کے لیے نہیں تھا۔

جواب

ہم کہتے ہیں کہ نماز کے بعد اگر ذکر جہراً استحباباً معمول نہیں تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مطلقاً جائز ہی نہیں ہے۔ حدیث سے مطلق جواز ثابت ہے، خواہ یہ کسی وقت بھی ہو، مطلوب ہمارا یہی ہے کہ مطلقاً جواز ثابت ہو جائے۔

۴۱ امام حاکم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو شخص بازار میں داخل ہو اور لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو علی کل شی قدیر (اللہ کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، ملک اسی کا ہے اور حمد کے لائق بھی وہی ہے، زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر شئی پر قادر ہے) پڑھے اللہ تعالیٰ اسے ایک لاکھ نیکی عطا فرماتے ہیں۔ (کچھ اسناد میں ہے کہ بلند پڑھے)

---

[1] امام نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں فرمایا، یہ حدیث دلیل ہے جو کچھ اسلاف نے فرمایا، کہ فرض نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر مستحب ہے۔ اس مستحب کہنے والوں میں ابن حزم ظاہری ہیں، نہ تو آج ابن حزم کے پیروکار ہی سب سے زیادہ اسے بدعت کہنے میں پیش پیش ہیں، یعنی گنگا الٹی بہہ رہی ہے۔ (مترجم)

۴۲ محدث سعید بن منصور نے عبید بن عمیر کے واسطے سے سیدنا فاروق اعظم سے اور ابو عبید نے ایک اور سند سے حضرت فاروق اعظم سے اور بیہقی نے بھی فاروق اعظم سے اور امام بخاری نے بھی تعلیقاً" فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کیا کہ آپ نے اپنے قبہ منیٰ میں کہیں تکبیر فرماتے تو مسجد والے سن کر تکبیر کہتے سب بازاروں والے بھی تکبیر کہتے تو منیٰ کا پورا علاقہ تکبیر سے گونج اٹھتا۔

یہ احادیث ہیں ان سے اور ان کی مثل دیگر احادیث سے صراحتہ" بھی اور اشارۃ" بھی واضح ہے کہ ذکر جہر میں کوئی کراہت نہیں ہے' بلکہ ان احادیث میں تو اس بات پر بھی دلالت پائی جاتی ہے کہ ذکر جہر جائز اور مستحب ہے بھلا ایسا کیوں نہ ہو کہ ذکر جہر میں دلوں کو نرم کرنے اور رقت پیدا کرنے کا وہ اثر ہے جو سری میں نہیں ہے۔ حد سے بڑھا ہوا جہر (یعنی چلانا) شرعاً ممنوع ہے' اور جہر میانہ (غیر مفرط) بھی اس صورت میں ممنوع ہے جب اس سے کسی سونے والے یا نماز پڑھنے والے کو اذیت و تکلیف پہنچے یا اس میں ریاکاری کا شبہ پیدا ہو جائے یا غیر مشروع خصوصیات ذکر میں داخل کر دی جائیں یا اسے اسی طرح لازم و فرض قرار دیا جائے جیسے باقی ملزومات و فرائض ہیں۔ بہت ساری صباح چیزیں ہوتی ہیں' جن میں لزوم نہیں ہوتا اور انہیں لازم قرار دے دیا جاتا ہے یا ان میں تخصیص نہیں ہوتی تو ان میں اپنی طرف سے تخصیص پیدا کر دیا جاتی ہے تو وہ پھر مکروہ ہو جاتی ہے۔ علامہ علی القاری نے شرح مشکوۃ میں اور علامہ حصفی نے درالمختار میں اور دیگر علماء نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

آپ ہرگز یہ خیال بھی نہ کریں کہ ذکر جہر کا حکم حنفیوں کے اجماع کے خلاف ہے' کیونکہ یہ دعویٰ کہ سب حنفی ذکر جہر سے منع کرتے ہیں باطل ہے' علامہ بزازی نے اپنے فتاویٰ میں اسے جائز قرار دیا ہم یہ پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ سید حموی نے اشباہ کے حواشی میں جو یہ بات لکھی ہے کہ بزازی کا کلام فتاویٰ میں مضطرب ہے' کبھی تو وہ اسے حرام کہتے ہیں اور کبھی جائز مانتے ہیں۔ صحیح نہیں ہے' کیونکہ بزازی نے خود تو جائز کہا ہے' اس کی حرمت انہوں نے فتاویٰ قاضی خان کے حوالے نقل کی ہے' لہٰذا ان کے کلام میں اضطراب نہیں۔ دوسرے حنفی جنہوں نے ذکر جہر کو جائز قرار دیا ہے وہ افضل متاخرین علامہ خیرالدین

رملی ہیں۔ جنہوں نے اپنے فتاویٰ میں جائز کہا اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

جائز کہنے والوں میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے رسالے "توصیل المرید الی المراد ببیان احکام الاحزاب والاوراد" میں فارسی زبان میں طویل کلام میں اس کے جواز کے بارے میں لکھا ہے۔ بندہ ان کی عبارت کو عربی میں نقل کر رہا ہے۔

"ہم کہتے ہیں جہر اور اعلان' ذکر و تلاوت میں اور مجالس و مساجد میں ذکر کے لیے اکٹھا ہونا جائز اور مشروع ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے جس میں آتا ہے کہ "جو مجھے گروہ میں ذکر کرتا ہے میں اسے ایسے گروہ میں ذکر کرتا ہوں' جو اس کے گروہ سے افضل ہوتا ہے۔" اللہ کریم کا ارشاد ہے' (یوں ذکر) "جس طرح اپنے آباء کا ذکر کرتے ہو اس سے بھی بڑھ کر کرو۔" یہ بھی ذکر جہر کی دلیل ہے۔

صحیح بخاری میں ابن عباس سے مروی ہے' انہوں نے فرمایا' ہم لوگوں کا نماز سے فارغ ہو کر واپس لوٹنا صرف جہر ذکر سے ہی پہچانتے تھے۔ صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ وہ بلند آواز سے چوتھا کلمہ لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو حیی لایموت ابدا ابدا ذوالجلال والاکرام بید الخیر وھو علی کل شی قدیر پڑھا کرتے تھے' کچھ روایات میں اس کلمے کو خاص طور پر نماز فجر اور نماز مغرب کے بعد پڑھنا ثابت ہے۔

حضور علیہ السلام کے اس ارشاد "اے لوگو اپنی جانوں کو سکون و آرام پہنچاؤ' کیونکہ تم بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو۔" کا سیاق بتاتا ہے کہ یہ ممانعت جہر کے غیر مشروع ہونے کے لیے نہیں تھی بلکہ سہولت و آرام کے لیے تھی' ورنہ سرکار کریم علیہ التسلیم کا اذکار و ادعیہ (دعاؤں) میں ذکر جہر فرمانا' لاتعداد مقامات پر ثابت ہے اور اسلاف کا اس پر عمل رہا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے' صحابہ کرام جب خندق کھودنے میں مصروف تھے اور وہ بھوک کی تکلیف میں مبتلا تھے تو سید کل علیہ السلام نے ان کے حال کو ملاحظہ فرمایا' آپ فرما رہے تھے "'اے اللہ زندگی تو صرف آخرت کی زندگی ہے' انصار و مہاجرین کو بخش دے۔" یہ

سن کر صحابہ کرام جواب میں عرض کرتے، ''ہم وہ ہیں جنہوں نے پوری زندگی کے لیے سرکار رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے بیعت کی ہے۔''

حاصل کلام یہ ہے، مخصوص مقامات اور معین جگہوں میں ذکر جہر کے وقوع میں تو کوئی اختلاف نہیں، کلام صرف اس بات میں ہے کہ اگر ایک واقعہ (قضیہ) مین کوئی حکم ثابت ہو جائے، کیا وہ اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ وہ حکم عام ہو جائے یا ایسا نہیں ہو سکتا اب جو ذکر جہر کے خلاف ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ شاید ان مواقع پر ذکر ہر کو کوئی خاص فائدہ ہو، جو دوسری جگہوں پر نہ پایا جاتا ہو یا یہ کہہ دے کہ ذکر اور دعا کو ملا کر پڑھنا جائز ہو اور ذکر یا دعا کو الگ الگ پڑھنا جائز نہ ہو، تو پھر ضروری ہے کہ وہ دلائل ذکر کیے جائیں جن سے ثابت ہو کہ یہ جواز عام ہے۔ ——— محض ذکر جہر کے لیے اکٹھا ہونا متفق علیہ حدیث سے ثابت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے راستوں میں ذکر کے حلقے تلاش کرنے کے لیے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ (الحدیث) ایک اور روایت میں ہے کہ مسلمان حضرات جس کسی مجلس میں ذکر خداوندی کے لیے بیٹھتے ہیں، تو انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں۔ ان پر سکون نازل ہوتا ہے اور ان پر رحمت چھا جاتی ہے۔'' یہاں ذکر سے مراد علمی مذاکرہ یا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاد، بعید از قیاس ہے، بلاوجہ کسی لفظ کو ایسے معنی پر محمول کرنا جو متبادر الی الذہن (ذہن میں فوری آجانے والا) نہیں ہے، ناجائز ہے۔[1]

یہ کہہ دینا کہ لوگ ذکر کے لیے اکٹھے ہوں تو اس سے جہر ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں سے ہر ایک الگ الگ ذکر خفی بھی تو کر سکتا ہے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر ذکر سری کرنا تھا تو اس اجتماعی کا کیا فائدہ ہے۔

اب رہی دوسری بات کہ کیا صرف دعا کے لیے اکٹھا ہونا جائز ہے؟ تو یہ بھی جائز ہے امام حاکم نے مرفوعاً امام مسلم کی شرائط کے تحت یہ حدیث نقل فرمائی ہے'' کہ جو

---

[1] یعنی یہ کہنا کہ اس سے مراد علمی محافل ہیں ناجائز ہے۔ مترجم)

گروہ بھی اکٹھا ہوتا ہے' اور ان میں سے کوئی دعا مانگتے ہیں اور کوئی آمین کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو قبول فرما لیتے ہیں۔

اب رہا تلاوت کے لیے اجتماع تو وہ بھی اس حدیث سے ثابت ہے کہ "کہ جب لوگ اللہ کریم کے کسی گھر میں اکٹھے ہوتے ہیں اور قرآن پڑھتے ہیں' ایک دوسرے کو درس دیتے ہیں تو لازماً انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں۔" امام ندوی نے اس حدیث کی تصحیح فرمائی ہے۔

ان احادیث سے ہی علماء نے مساجد و مجالس میں احزاب (وظائف) و اوراد کا پڑھنا جائز سمجھا ہے۔

امام مالک اور ان کے ساتھی ان سب ادوار کو مکروہ سمجھتے ہیں' کیونکہ اسلاف نے اس طرح عمل نہیں کیا' وہ ان ذرائع کو بند کر کے بدعت کے مواد کو قطع کرنا چاہتے ہیں' تاکہ دین میں زیادتی نہ ہو اور لوگ واضح حق سے کہیں الگ نہ ہو جائیں اب کچھ واقعی ایسی باتیں ہونے لگ گئی ہیں' جن کا حضرت امام مالک کو خوف تھا اور وہ ان سے بچنا چاہتے تھے۔[1]

۴۳ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ شریف کی شرح میں حضرت ابی بن کعب کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب وتر کی نماز سے فارغ ہوتے تو سبحان الملک القدوس تین دفعہ فرماتے' تیسری دفعہ بلند آواز سے پڑھتے۔ اسے امام ابن ابی شیبہ' امام احمد اور دار قطنی نے روایت کیا ہے' (یہ ذکر جہر کی تینتالیسویں دلیل ہے) اس حدیث سے ثابت ہے کہ ذکر جہر مشروع ہے اور شریعت میں بلاشبہ ثابت ہے' لیکن افضل ذکر خفی ہے۔

اب ایک اور حنفی حضرت علی القادری سے بھی سنتے چلیں' وہ مرقات میں اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے مظہر سے نقل کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ذکر جہر نہ

---

[1] حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ نے صرف اس وجہ سے ممانعت فرمائی کہ دین میں کوئی ایسی بات شامل نہ ہو' جو دین میں سے نہیں' لیکن اگر ان محافل کو سنت کے تابع رکھا جائے جیسا کہ مشائخ عالی مقام کرتے ہیں تو پھر امام مالک کی ممانعت بھی نہیں رہے گی اور وہ اسے مکروہ نہیں فرمائیں گے۔ (مترجم)

صرف جائز بلکہ مستحب ہے، بشرطیکہ ریا سے بچا جائے اس طرح ذکر کرنے سے دین کا غلبہ ہوتا ہے، سامعین کو تعلیم ملتی ہے اور وہ غفلت سے بیدار ہو جاتے ہیں، ذکر جہر سے ذکر کی برکت وہاں تک پہنچتی ہے، جہاں تک آواز جاتی ہے۔ سب درخت، جانور اور ذرات اس برکت سے فائدہ پاتے ہیں، یہ سن کر دوسرے لوگ بھی اس خیر کی پیروی کرتے ہیں اور ہر رطب و یابس ذکر کرنے والے کے لیے گواہی دیتا ہے۔ [1]

ہاں کچھ مشائخ ذکر خفی کو پسند کرتے ہیں، کیونکہ اس میں ریا نہیں ہے، مگر یہ تو نیت پر موقوف ہے۔

یہ کوئی مخفی بات نہیں کہ علامہ علی القاری کا خاموش رہنا اور مظہر کی عبادت نقل کر کے اس کی تردید نہ کرنا جبکہ ان کی عادت اپنی سب تصانیف میں یہ ہے کہ وہ مخالف کی لازماً تردید کرتے ہیں۔ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بھی ذکر جہر کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حصن حصین کی شرح میں ان کی کچھ عبارات کا میلان بھی اسی بات کی طرف ہے، اگرچہ کچھ اور مقامات پر ان کی کچھ عبارات اس کے جواز کے خلاف ہیں۔

۴۴ چوالیسویں دلیل جواز یہ ہے کہ اصحاب سیر، سیرۃ شامیہ، مواھب لدنیہ وغیرہ نے ابن سعد سے اس واقعہ میں روایت لی ہے، جب حضرت محمد بن مسلمہ نے رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سمیت (گستاخ رسول) کعب بن اشرف کو قتل کر دیا، جب وہ واپس پلٹے اور بقیع غرقد (جنت البقیع) میں پہنچے تو زور سے تکبیر کہی۔ حضور علیہ السلام اس رات میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ ان لوگوں کی تکبیر سن کر سرکار علیہ السلام نے بھی تکبیر پڑھی، آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ اسے مار کر آ رہے ہیں۔ [2]

---

[1] علامہ علی القاری نے یہاں مظہر سے نقل کرتے ہوئے ذکر جہر کے چھ فائدے شمار فرمائے ہیں، ان سب پر خصوصی غور کرنا چاہیے۔ مترجم)

[2] صحاح میں بھی اس کے قتل کا واقعہ مندرج ہے۔ سرکار کریم علیہ التسلیم اس گستاخ کے قتل تک مسجد نبوی میں نماز ادا فرماتے رہے اور اپنے غلاموں کی واپسی کے منتظر رہے جونہی انہوں نے واپسی پر تکبیر بلند آواز کہی تو سید کل علیہ السلام نے بھی تکبیر سے ہی جواب دیا، یہ تکبیر اس کے قتل ہو جانے کا اعلان تھا۔ مترجم)

۴۵ نعیم ابو نعیم نے حلفیہ الاولیاء میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو مسلم خولانی بڑی کثرت سے بلند آواز سے تکبیر کہتے تھے' بچوں کو ساتھ ملا کر بھی وہ تکبیر کہتے اور فرماتے' اللہ کا ذکر اتنا کرو کہ جاہل تمہیں پاگل شمار کریں۔

۴۶ امام ابو نعیم نے ہی حضرت ابو یونس سے روایت کیا ہے کہ ایک دن حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی' جب سلام پھیرا تو بلند آواز سے کہا (سب تعریفیں اس اللہ کریم کے لیے ہیں' جس نے دین کو ذریعہ قیام بنایا اور ابو ھریرہ کو امام بنا دیا' حالانکہ وہ تو مزدور (غلام) تھا۔

۴۷ ابو نعیم نے ہی مضارب سے نقل کیا ہے کہ میں ایک رات چل رہا تھا کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بلند آواز سے تکبیر کہہ رہا ہے میں نے اپنے اونٹ کو اس سے جاملایا اور پوچھا' یہ تکبیر کہنے والا کون ہے؟ جواب ملا میں ابو ھریرہ ہوں' میں نے پوچھا' اس وقت یہ تکبیر کس لیے ہے' انہوں نے جواب دیا' اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا ہوں۔

۴۸ محدث' بزار' طبرانی' ابو نعیم (حلیہ میں) بیہقی رحمہ اللہ (دلائل میں) اور ابن عساکر نے سیدنا عمر بن الخطاب کے اسلام لانے کے واقعہ میں لکھا ہے کہ جب سرکار علیہ السلام کی خدمت میں دار ارقم حاضر ہوئے تو عرض کیا' اشھد ان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یقیناً" آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) (یہ دیکھ) دار ارقم والوں نے اتنے زور سے تکبیر کہی (نعرہ تکبیر بلند کہا) کہ مسجد حرام والوں نے آواز سنی۔

خلاصہ بحث

اس مقام پر خلاصہ بحث یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر جہری سے ذکر سری افضل ہے' کیونکہ اس میں عاجزی و خفا ہے۔ اسی طرح اس میں بھی شک نہیں کہ چلانا (حد سے بڑھا ہوا جہر) بھی "اپنی جانوں کو پر سکون رکھو۔" والی حدیث کی وجہ سے ممنوع ہے۔

اب رہی بات عام جہر (جو حد سے بڑھا ہوا نہ ہو) کی تو احادیث بالکل ظاہر ہیں اور آثار بکثرت ہیں کہ وہ جائز ہے کوئی بھی دلیل اس کی حرمت و کراہت پر نہیں ہے۔ پھر

محدثین، شافعی فقہا اور بعض حنفی فقہا نے بھی اس کے جواز پر تصریحات کی ہیں۔ کتاب الحج میں نہایتہ کا قول بھی اس کی دلیل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں اذکار میں مستحب خفا ہے۔ ہاں جہاں ذکر جہر کا اعلان مقصود ہو (تو وہاں جہر ہی لازم ہے) مثلاً اذان، تلبیہ اور خطبہ مبسوط میں بھی اسی طرح ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہے جہر حرام ہے، اس سے مراد حد سے بڑھا ہوا جہر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان حضرات نے سرکار علیہ السلام کے اس ارشاد کو بطور استدلال پیش کیا ہے جس میں سرکار ابد القرار علیہ السلام نے فرمایا "اپنی جانوں کو پرسکون رکھو" آپ اس حدیث کے شان نزول پہچان چکے ہیں کیونکہ جہر مفرط پر یہ حدیث وارد ہوئی تھی۔ مطلقاً جہر کے بارے میں یہ حدیث نہیں تھی۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ قطعی حرمت خبر واحد سے کیسے ثابت ہو سکتی ہے جو خود دلیل ظنی ہے۔ [1]

جن لوگوں نے کہا کہ ذکر جہر بدعت ہے، تو ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ مخصوص طریقے سے اس کی ادائیگی اور ایک لازم و فرض چیز کی طرح اسے لازم قرار دے دینا شریعت میں کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے اور اس پر بدعت کا لفظ انہوں نے صرف عید الفطر کی نماز کے لیے راستے میں تکبیر جہراً کہنے پر کیا۔ انہوں نے کہا کہ بلند آواز سے مخصوص انداز پر یہ تکبیر کہنا صرف عید الاضحیٰ میں ہی وارد ہے۔ لہٰذا اسی انداز سے عید الفطر میں کہنا بدعت ہے۔ آپ اس مقام پر غور کریں تاکہ اصل مقصد واضح ہو جائے۔ یہاں بے شمار قدم پھسلے ہیں۔ کئی گروہ اس مقام پر حیرت زدہ ہوئے ہیں۔ رد و قبول میں جلد بازی

---

1. علامہ نے بہت اچھا نکتہ بیان فرمایا ہے، ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ خبر واحد (ایک راوی کی روایت) دلیل بھی ہوتی ہے۔ اس سے قطعی اور حقیقی حرمت ثابت نہیں ہوتی تو پھر زیر بحث موضوع میں چونکہ خبر واحد ہے اس سے حقیقی حرمت ثابت نہیں ہو سکے گی، پھر ذکر جہر کیسے حرام ہو گا۔ مترجم)

سے بچنا چاہیے کیونکہ جلد بازی عوام کا طریقہ ہے۔[1]

تتمہ

ذکر سری اور ذکر جہری کے علاوہ یہاں ایک اور ذکر بھی ہے جسے ذکر قلبی کہتے ہیں۔ بعض فقہا نے تو سرے سے اس کا انکار کر دیا۔ کہنے لگے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ حق بات یہ ہے

کہ یہ سینہ زوری ہے۔ کیونکہ ذکر (یاد) بمقابلہ نسیان (بھول) ہے اور یہ دونوں (ذکر و نسیان) دراصل دل کے فعل ہیں' زبان کے نہیں۔ وہاں ذکر لسانی (زبان کا ذکر) کے لیے مخصوص علامات اور معلوم احکام ہیں جو ذکر قلبی کے لیے نہیں ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فعل قلب پر اطلاق ذکر کی نفی کر دی جائے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے رسالہ "تنبیہ اہل الذکر برعایتہ آداب الذکر" میں ذکر کیا ہے کہ "حصن حصین کی شرح "الحرز الثمین" میں ہے "جس نے مجھے اپنے جی میں ذکر کیا تو میں اسے اپنے جی میں ذکر کرتا ہوں" (الحدیث) اس حدیث میں دلیل ہے کہ ذکر قلبی افضل ہے۔ پھر زبان کا سری ذکر ہے۔ کیونکہ یہ وارد و منقول ہے کہ ذکر خفی کو محافظ فرشتے بھی نہیں سنتے تو اس کا ثواب ستر گنا زیادہ ہے۔ یہ بھی آتا ہے کہ سب سے بہتر ذکر خفی ہے۔

اس کتاب میں مصنف کے اس قول "ہر مشروع ذکر خواہ واجب ہو یا مستحب قابل اعتماد و قابل شمار نہیں ہے جب تک اس کا اپنا جی اسے نہ سنے" کی شرح میں علامہ شارح فرماتے ہیں یہ صرف ان اذکار کے لیے ہے جن کے بارے میں شارع علیہ السلام نے فرمایا

---

[1] معلوم ہوا کہ لفظ بدعت اصحاب علم نے صرف ان تکبیرات پر استعمال کیا ہے' جو عید اضحیٰ والی تکبیرات کی طرح ان سب لوازمات کے مطابق پڑھی جائیں۔ رہا اہل تصوف کا ذکر جہر تو اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس سے ان حضرات نے بدعت کہا ہے۔ پتہ چلا کہ محدثین و فقہاء نے حرام اور بدعت اور معنوں میں استعمال فرمایا تھا اور کچھ لوگوں نے اسے اصطلاحی معنوں میں استعمال کر کے خواہ مخواہ خلط مبحث کر دیا اور امت کے عطر "اولیاء ملت" کے عمل پاک کو حرام اور بدعت کہہ دیا۔ (مترجم)

کہ انہیں زبان سے ذکر کیا جائے۔ مثلاً نماز کی قرات، تشہد، تسبیحات نماز وغیرہ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زبان سے لفظ ادا کیے بغیر اگر دل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو شرعاً وہ قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس کا اعتبار کیے بغیر ذکر دوام تو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ اذکار کی افضل قسم ہوئی۔

محدث ابو یعلیٰ موصلی نے اپنی سند میں حضرت سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا سے مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ سب سے افضل وہ خفی ذکر ہے جسے محافظ فرشتے بھی نہیں سنتے۔ قیامت کے دن فرشتوں سے کہا جائے گا دیکھو اس کا کوئی عمل باقی رہ گیا ہے؟ فرشتے جواب دیں گے جو ہمارے علم اور حفاظت میں بات تھی، وہ سب ہم نے لکھ لی اور جمع کرلی (کچھ بھی باقی نہیں ہے) اللہ تعالیٰ اس بندے کو فرمائیں گے میرے پاس تیری اور نیکی بھی ہے جس کا تجھے بھی علم نہیں۔ میں اس کا بھی تجھے بدلہ دوں گا اور وہ یہ ہے ذکر خفی۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اسی طرح "البدور السافرہ فی احوال الاخرۃ" میں ذکر کیا ہے۔

جامع میں ہے کہ بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق بقدر کفایت ہے۔ اسے امام احمد ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

ذکر قلبی کے تابع ذکر نفسی بھی ہے۔ ذکر نفسی یہ ہے کہ سانس لیتے اور سانس نکالتے وقت لا الہ الا اللہ کا ذکر کیا جائے۔ یا اسی طرح کسی اور لفظ سے کیا جائے (مثلاً اللہ ھو) یہ حسین ذکر ہے۔ اس سے فرشتوں سے مشابہت ہو جاتی ہے۔ محدث ابو الشیخ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی "وہ رات دن تسبیح کہتے ہیں" کے ضمن میں حضرت حسن سے روایت لی ہے کہ فرمان خداوندی ہے کہ میں نے ان کے سانس ہی ان کی تسبیح بنا دیے ہیں۔

شیخ ابن منذر، ابن ابی حاتم، بیہقی، (شعب الایمان) اور ابو الشیخ نے عبداللہ بن حارث سے روایت لی ہے کہ میں نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اللہ کریم کے اس ارشاد پاک "وہ ذکر چھوڑتے ہی نہیں ہیں" کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے آخر پیغام خداوندی بھی پہنچانا ہوتا ہے اور بھی تو کئی کام کرتے ہوتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان کے لیے تسبیح بالکل ایسے ہے جیسے آپ لوگوں کے لیے

سانس ہے۔ کیا آپ کھاتے پیتے' اٹھتے' بیٹھتے' آتے جاتے اور بولتے ہوئے سانس نہیں لیتے رہتے۔ اسی طرح ان کے لیے تسبیح ہے۔ وہ رات دن تسبیح کہتے ہیں اور اسے ختم نہیں کرتے۔ تو یہ حدیث ذکر نفسی کے لیے ایک اصل اصیل (بنیاد) اور عظیم ماخذ ہے۔ اسے یاد فرمائیے۔ یہ وقت کا عطیہ اور فیضان ہے۔

دوسراباب

(وہ مقامات جہاں شریعت نے جہر کا حکم دیا ہے)

اذان:

شرع نے اذان کہنے کا حکم دیا ہے۔ اس پر سب اہل علم متفق ہیں۔ ہونا بھی تو یہی چاہیے۔ کیونکہ اذان اطلاع اور خبردار کرنے کے لیے ہوتی ہے اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ بلند آواز سے ہو۔ لہٰذا فقہا نے تصریح فرمائی ہے کہ موذن کا بلند آواز ہونا مستحب ہے۔ انہوں نے یہ بات حضرت عبداللہ بن زید کے خواب میں اذان سننے کے قصے سے اخذ کی ہے کہ جب انہوں نے خواب کے الفاظ سید کل علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیے تو سرکار علیہ التسلیم نے فرمایا بلال کو یہ کلمات بتاؤ۔ کیونکہ ان کی آواز تم سے اونچی ہے۔ وہ اٹھے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بتاتے گئے اور بلال اذان کہتے گئے اور پھر سرکار علیہ السلام کی حیات طیبہ میں وہی آپ کے موذن رہے۔ ابوداوٗد' ترمذی' ابن خزیمہ (اپنی صحیح میں) اور امام احمد نے مسند میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امام احمد کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ پھر حضرت بلال اذان کہتے رہے۔ پھر ایک صبح نماز صبح کے لیے حضور علیہ السلام کو بلانے آئے۔ بتایا گیا کہ سرکار کریم علیہ التسلیم ابھی آرام فرمارہے ہیں۔ حضرت بلال نے بلند آواز سے کہا "الصلوۃ خیر من النوم" پھر یہ کلمہ بھی صبح کی اذان میں شامل کرلیا گیا۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور ابن ماجہ وغیرہ نے بھی عمدہ سندوں سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

عینی شرح ہدایتہ میں ہے کہ یہ مستحب ہے کہ موذن اپنی آواز بلند کرے۔ حضرت ابو محذورہ والی حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ اپنی آواز پلٹایئے اور آواز کو خوب کھینچیے اور

حضرت عبداللہ والی حدیث میں ہے یہ الفاظ بلال کو بتایئے کیونکہ ان کی آواز تمہاری آواز
سے اونچی ہے۔ کیونکہ اذان کا مقصد دوسروں کو آگاہ اور اطلاع کرنا ہے۔ لہٰذا موذن کے
لیے افضل بات یہ ہے کہ وہ ایسی جگہ پر ہو جہاں سے اردگرد کے لوگ اچھی طرح سن
سکیں۔ مثلاً میذنہ (اذان کا مینار) وغیرہ۔ کیونکہ ابو بردہ سلمیؓ والی حدیث میں ہے کہ مینار پر
اذان کہنا سنت ہے۔ اقامت (تکبیر) مسجد کے اندر ہونی چاہیے۔ یہ ابوالشیخ اور حافظ
ابوالقاسم تمام بن محمد رازی نے نقل کیا ہے لیکن یہ مناسب نہیں کہ اپنے نفس کو حد سے
بڑھ کر زیر عمل کرے۔ اس طرح تو ضعف اور کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ جامع المضمرات میں
ہے کہ طاقت سے بڑھ کر آواز بلند کرنا موذن کے لیے مکروہ ہے۔

آوز بلند کرنے کے استحباب سے کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں

(الف) مستحب یہ ہے کہ انگلیاں کانوں میں ڈال لے تاکہ آواز بلند ہو سکے
"ہدایہ" میں ہے کہ موذن کے لیے یہ افضل ہے کہ انگلیاں دونوں کانوں میں ڈالے۔ اگر
ایسا نہ کیا تب بھی ٹھیک ہے کیونکہ یہ سنت املیہ نہیں ہے۔ شارحین ہدایہ کا اس جملہ کی
شرح میں اختلاف ہے (کہ انگلیاں کانوں میں نہ ڈالیں تو بھی حسن ہے) صاحب "الدرایہ"
کا قول ہے کہ اذان حسن ہے ترک فعل (کانوں میں انگلیاں نہ ڈالنا) اچھا نہیں۔ کیونکہ اس
کا حکم تو سید کل علیہ السلام نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیا تھا۔ اس کا چھوڑنا بھلا کیسے
حسن ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اصلی سنتوں میں شامل نہیں ہے تو اس کا چھوڑنا حسن اذان
کے زوال کا سبب نہیں بن سکتا۔ صاحب "عنایہ" نے اس کی اتباع کی ہے۔

سروجی نے "غایہ" میں یہی کچھ لکھا ہے۔

"تاج الشریعہ" فرماتے ہیں کہ صاحب ہدایہ نے اس لیے اس طرح لکھا ہے کہ
کانوں میں انگلیاں ڈالنا اذان میں اصل اور مشہور سنتوں میں شامل نہیں ہے۔ خواب والی
حدیث میں بھی کانوں میں انگلیاں ڈالنے کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اذان میں مشروع ہونے
والی باتوں کا سبب تو یہی خواب والی اذان تھی۔

"نہایہ" والے مصنف فرماتے ہیں حسن سے مراد حسن اذان ہے۔ "فوائد ظہیریہ"
میں یہی مذکور ہے۔ شیخ کا قول ہے کہ اس کی مثال حضور علیہ السلام کا حضرت عمر کو فرمانا

اگر وہ لوٹیں تو تم بھی لوٹو۔ یعنی اگر وہ پھر جبر کریں تو تم بھی اپنی جان بچانے کے لیے ایسا ہی عمل کرو۔ "غایۃ البیان" کے مصنف کہتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ دونوں انگلیاں دونوں کانوں میں ڈالی جائیں۔ اگر یہ افضل ہے کوئی چیز پھر فاضل بھی ہونی چاہیے۔ تو جب اس کا کرنا افضل ہو گا تو اس کا نہ کرنا اور چھوڑ دینا فاضل ہو گا۔ [1]

یہ تھا شارحین ہدایہ کا کلام۔ ان سب کے بعد عینی آئے تو سب کی تردید کر دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب دائرہ سے نکل گئے ہیں۔ کیونکہ یہ ترکیب اگرچہ غریب و اجنبی ہے مگر ان تاویلات کو قبول نہیں کرتی۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ صاحب ہدایہ کی اس عبارت (لم یفعل) میں ضمیر مرفوع موذن کی طرف راجع ہے اور مفعول محذوف ہے اور فحسن جواب شرط ہے۔ یعنی اس جملے کا معنی یہ ہے۔ اس کا ایسا نہ کرنا (کانوں میں انگلیاں نہ ڈالنا) حسن ہے (اسی معنی سے تو بچنے کے لیے شراح ہدایہ نے مندرجہ بالا تاویلات کی تھیں) جن حضرات نے یہ بات کہی ہے کہ یہ سنن اصلیہ میں شامل نہیں ہے ان کی یہ بات بھی بے معنی ہے کیونکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ سنت کی دو قسمیں ہیں۔ اصلی اور فرعی۔ اس طرح کی تقسیم تو کسی نے بھی نہیں کی ہے بلکہ جس کا بھی حکم سید کل علیہ السلام نے دیا ہے، وہ حسن ہے تو پھر یہ (کان میں انگلی ڈالنا) کیوں سنت اصلیہ نہیں بنی۔ اس کے سنت اصلیہ ہونے کے بارے میں تو محدثین نے کئی احادیث بھی نقل کی ہیں۔ سروجی کا کہنا ہے کہ اس کے بغیر بھی اذان حسن ہے۔ بذات خود یہ قول حسن نہیں ہے کیونکہ اذان اس کے بغیر کیسے حسن ہو سکتی ہے۔ جب کہ اس کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔

سغناقی کا یہ کہنا کہ ظہیریہ میں لفظ حسن مذکور ہے بالکل بودی بات ہے۔ کیونکہ حسن کے لفظ کی نسبت اذان کی طرف کرنا کوئی عجیب اور نرالی بات نہیں ہے۔ ان کا یہ کہنا بھی کہ

---

[1] مطلب یہ ہے اسم تفضیل اسم فاعل پر زیادتی کا نام ہے۔ جب اسم تفضیل والی زیادتی ختم ہوتی ہے تو اسم فاعل باقی رہ جاتا ہے۔ یہاں اسم تفضیل افضل ہے افضل نہ رہا تو اس کا اسم فاعل فاضل باقی رہ جائے گا۔ جب کانوں میں انگلیاں ڈالنا افضل ہوا اور وہ نہ رہا، یعنی انگلیاں کانوں میں نہ ڈالی گئیں تو یہ فاضل ہو گا اور فاضل ٹھیک (حسن) ہی ہوتا ہے۔ مترجم)

شیخ نے کہا ہے بالکل ضعیف بات ہے۔ یہ اس کی نظیر دور از کار تاویلات سے ہو سکتی ہے
(جو اچھی بات نہیں)

"غایت البیان" کے مصنف کا قول (افضل نہیں فاضل والی بات) تو ترکیب
دائرہ سے ہی خارج ہے۔ اس مقام سے بچ نکلنے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں
کہ اصل عبارت یوں سمجھی جائے۔ اگر موذن نے اپنی دونوں انگلیاں دونوں کانوں م
نہیں ڈالیں بلکہ کانوں کے اوپر رکھ دی ہیں تو بھی حسن ہے۔ کیونکہ امام احمد نے حضرت ا
محذورہ کی حدیث میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے چاروں انگلیاں ملالیں اور اپنے دونو
کانوں پر رکھ دیں۔ اس سے اشکال (جو صاحب ہدایہ کے کلام سے پیدا ہوا تھا) زائل
جائے گا۔

ایک سوال

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انگلیوں کو کانوں میں رکھنا کیسے مستحب ہوگا۔ جب کہ ابن ماجہ
روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ وہ اپنی انگلیا
اپنے دونوں کانوں میں رکھیں۔ فرمایا اس طرح تمہاری آواز زیادہ اونچی ہوگی۔ مستدر ک
میں امام حاکم نے عبداللہ بن عمار بن سعد قرظی سے روایت کی ہے۔ وہ اپنے باپ (عم
سے) وہ سعد القرظ (یہ بھی حضور کے ایک موذن تھے) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کر
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو فرمایا جب تم اذان کہو تو دو انگلیاں دو کانوں میں ڈ
لو۔ اس سے تمہاری آواز بلند ہوگی۔ سروجی نے ہدایہ کی شرح میں لکھا ہے کہ ابن حبان
روایت کیا کہ رسول اقدس علیہ السلام نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ وہ اپنی دو انگلیاں ا
دو کانوں میں ڈالیں۔

عینی فرماتے ہیں کہ یہ صاحب صحیح ابن حبان والے نہیں ہیں۔ یہ "ی" سے ا
حیان یعنی ابو الشیخ اصبہانی ہیں۔ جنہوں نے اسے کتاب الاذان میں لکھا ہے۔

محدث ابو بکر بن حزیمہ نے عون سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کرتے
کہا کہ میں نے حضرت بلال کو اذان دیتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے دو انگلیاں اپنے دو کانو

میں ڈال رکھی تھیں۔ یہ سب ---- چاروں روایات --- اس بات کی دلیل ہیں کہ سید کل علیہ السلام نے اس عمل کا حضرت بلال کو حکم دیا تھا تو پھر یہ مستحب کیسے ہوا؟ (یہ تو لازماً سنت ہونا چاہیے)

جواب

ہم کہتے ہیں امر یہاں وجوب کے لیے نہیں' استحباب کے لیے ہے اور اس پر شاہد حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے کہ اس سے تمہاری آواز زیادہ بلند ہوگی۔ کانوں میں انگلیاں ڈالنے کی یہ حکمت ہے اس سے حضور علیہ السلام نے اشارہ فرمایا دیا کہ یہ ضروری نہیں ہے اس بات پر دلیل وہ حدیث بھی ہے جو تعلیقاً امام بخاری نے روایت کی۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اور عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں بطور وصل اس کا ذکر فرمایا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اپنی دونوں انگلیاں دونوں کانوں میں اذان میں نہیں ڈالتے تھے۔ اگر یہ بات ضروری ہوتی تو وہ لازماً اس پر عمل فرماتے۔

صاحب نہایہ' تاج الشریعہ اور زیلعی اور ان کے متبعین نے کنز الدقائق کی شرح میں کہا ہے کہ انگلیاں کانوں میں ڈالنا اس لیے سنت نہیں ہے کہ خواب والی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے اور اس باب میں یہی حدیث اصل ہے۔ علامہ عینی نے ان سب پر گرفت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ابوالشیخ نے کتاب الاذان میں یزید بن ابو زیاد سے انہوں نے عبد الرحمان بن ابو یعلی سے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن زید انصاری سے روایت کیا۔ عبد اللہ فرماتے ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے لیے اہتمام فرمایا (الحدیث) اس حدیث میں ہے کہ وہ سطح مسجد پر کھڑے ہوئے اپنی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں میں ڈالیں اور اذان کہی۔ عبد اللہ بن زید نے خواب میں یہی دیکھا تھا۔ [1] عینی کی روایت میں یزید بھی ایک راوی ہیں۔ ان میں کچھ لوگوں نے کلام کیا ہے۔

---

[1] اس سے ثابت ہوا کہ خواب میں کانوں میں انگلیوں کے ڈالنے کا مشاہدہ ہوا تھا' لہٰذا صاحب نہایہ وغیرہ کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ مترجم)

ان حضرات کا مطلب انگلیاں کانوں میں ڈالنے سے انگشت شہادت کا ڈالنا ہے۔ کیونکہ باقی انگلیوں سے وہ افضل ہے۔ علامہ قہستانی وغیرہ نے یہی ذکر کیا ہے۔ (یہ بھی مجاز ہے) کیونکہ دو انگلیاں پوری کانوں میں نہیں آسکتیں۔ [1] اس طرح انگلیاں ڈالنا متوارث ہے۔

امام سیوطی نے کتاب الاوائل میں ذکر کیا ہے کہ پہلا آدمی جس نے اپنے ہاتھ کانوں کے پاس رکھے (اور انگلیاں کانوں میں نہیں ڈالیں) وہ حجاج کا موذن اصم تھا۔ اس سے پہلے سب موذن اپنی انگلیاں کانوں میں ڈالا کرتے تھے۔ یہی بات امام ابن سیرین سے سعید بن منصور اور ابن ابی شیبہ نے نقل کی ہے۔

(ب) قاضی خان اور صاحب خلاصہ نے ذکر کیا ہے کہ مسجد کے اندر اذان نہ کہی جائے۔ ان دونوں کا مقصد یہ ہے کہ اذان اونچی جگہ پر دینا سنت ہے۔ خواہ منارہ ہو یا کوئی اور اونچی جگہ ہو۔ کیونکہ وہاں سے آواز زیادہ بلند ہوتی ہے اور مسجد سے ایسا نہیں ہوتا۔ غنیہ میں ہے کہ اذان اونچی جگہ کہنا اور اقامت زمین پر کہنا سنت ہے۔ مغرب کی اذان میں علماء کا اختلاف ہے۔ البحر کے مصنف نے کہا کہ واضح بات ہے کہ مغرب کی اذان بھی اونچی جگہ پر مسنون ہے۔

(ج) موذن کے لیے یہ بھی مستحب ہے کہ وہ منار میں گھومے۔ اگر اس کے بغیر اس کی آواز نہ پہنچتی ہو کیونکہ صرف آواز بلند کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا (جب تک وہ ادھر ادھر سنائی نہ دے) حضرت بلال کی اذان میں بھی یہ گھومنا موجود ہے۔ ترمذی نے اسے روایت کر کے اس کی تصحیح کی ہے۔ یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ ابو داؤد نے حضرت ابو جحیفہ سے روایت کیا ہے کہ میں مکہ میں حضور علیہ السلام کی خدمت عالیہ مین حاضر ہوا تو آپ چمڑے کے سرخ قبہ میں تشریف فرما تھے۔ (الحدیث) اس حدیث میں ہے کہ میں نے حضرت بلال کو دیکھا کہ وہ ابطح کی طرف نکلے۔ انہوں نے اذان کہی جب حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح پر پہنچے تو دائیں بائیں گردن موڑی اور گھومے نہیں۔

---

[1] مراد یہ ہے کہ صرف پورے کانوں کے سوراخوں کے اوپر آجائیں۔ (مترجم)

(الحدیث) اس سے صراحتہ معلوم ہوا کہ گھومنا تو وہاں نہیں تھا۔ یہ اعتراض اس لیے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ گھومنا دوسری روایات میں موجود ہے۔ وہ احادیث ابوالشیخ، طبرانی اور دار قطنی وغیرہ نے نقل کی ہیں اور ہدایہ کی شرح میں علامہ عینی نے انہیں شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ اثبات نفی پر مقدم ہے۔ [1]

(د) عورت کی اذان مکروہ ہے۔ اس کی تعلیل قاضی خان اور محیط کے مصنف نے یہ کی ہے کہ اس کی آواز عورت (پردے کی شے) ہے لیکن یہ تعلیل ضعیف ہے۔ کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ عورت کی آواز عورت نہیں ہے۔ جیسا کہ شرح المنیہ، البحر اور درر وغیرہ میں اس کی تصریح ہے۔ تو پھر اس کی (عورت کی اذان مکروہ ہونے کی) بہتر تعلیل وہ ہے جس کی طرف صاحب بحر نے اشارہ کیا کہ اذان میں آواز بلند کرنا مستحب ہے اور عورت کو فتنہ کی وجہ سے بلند آواز کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے تو انہیں تسبیح سے بھی روکا گیا ہے۔ نابینا سے قرآن پڑھنے سے بھی روکا گیا ہے۔ ایسے ہی اور مقامات سے بھی روکا گیا ہے (تاکہ اس کی آواز کا فتنہ نہ جاگے) واضح رہے ہمارے نزدیک اذان کے ہر کلمے میں آواز کی بلندی میں مبالغہ مستحب ہے کیونکہ ہمارے نزدیک ترجیع نہیں ہے۔ یہاں شافعی حضرات کا اختلاف ہے۔ ان کے ہاں شہادت کے دونوں کلموں (اشہد ان لا الہ الا اللہ اور اشہد ان محمد رسول اللہ میں آواز بلند بھی کرتے ہیں اور پست بھی۔ [2]

ہمارے نزدیک ہر اذان میں ہر کلمہ بلند کرنا ہوتا ہے۔ ہاں جمعہ کی دوسری اذان میں ہمارے فقہاء کہتے ہیں زیادہ بلند نہ کرے۔ کیونکہ دوسری اذان اقامت کی طرح صرف حاضرین کی اطلاع کے لیے ہوتی ہے۔ اسی طرح احناف کے نزدیک فوت شدہ نماز کی قضا کے وقت بھی اذان زیادہ اونچی نہیں ہونی چاہیے۔ البحر میں ہے کہ مناسب یہ ہے کہ اگر نماز

---

[1] یعنی گھومنا ثابت ہے اور یہ مثبت ہے تو نہ گھومنا منفی ہے، لہٰذا اثبات کو منفی پر مقدم کرتے ہوئے گھومنے کا فتویٰ دیا جائے گا۔ مترجم)

[2] ترجیع کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ کلمہ پہلے آہستہ کہہ کر پھر بلند کہا جائے، اور شہادتین میں شافعی حضرات یہی کچھ کرتے ہیں۔ مترجم)

جماعت سے قضا کر رہے ہیں تو آواز اونچی ہو اور اگر کوئی اکیلا شخص نماز قضا کر رہا ہے تو اذان کی دھیمی آواز ہو اور اگر صحرا میں قضا اکیلے کر رہا ہو تو بھی آواز بلند رکھے۔ کیونکہ موذن کی آواز بلند رکھنے میں ترغیب شریعت میں وارد ہے۔ کیونکہ انسانوں، جنوں اور ٹیلوں تک جو بھی اس کی آواز سنتا ہے، قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دے گا۔ اگر گھر میں ہو پھر قضا نماز میں اذان اونچی نہ کہے میں نے آئمہ کے کلام میں کہیں یہ بات نہیں دیکھی (کہ گھر میں اذان دیتے ہوئے آواز بلند کرے) النہر الفائق میں بھی یہی لکھا ہے۔

(ہ) اقامت بھی ان چیزوں میں شامل ہے جہاں آواز بلند رکھنی ہوتی ہے، تاکہ حاضرین سن سکیں مگر اذان کی طرح مبالغہ اس میں مستحب نہیں ہے۔ تاتار خانیہ میں اسی طرح لکھا ہے۔ اسی لیے اس میں بھی یہ سنت نہیں کہ منارہ پر ہو۔ جیساکہ قنیہ کے حوالے سے البحر میں لکھا ہے۔ کیا اقامت میں کانوں میں انگلیاں ڈالنا مستحب ہے؟ ترمذی نے اوزاعی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ مستحب ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ مستحب نہیں۔ کیونکہ اقامت آہستہ ہوتی ہے۔ بحر الرائق میں اس کی تصریح ہے۔ [1]

(و) تثویب میں بھی آواز بلند ہونی چاہیے۔ تثویب کا مطلب اذان کے بعد دوبارہ لوگوں کو اطلاع کرنا ہے تو اس میں آواز بلند ہونی چاہیے۔ تاکہ فائدہ حاصل ہو۔ [2]

(ز) قرآن پڑھتے ہوئے بھی آواز بلند ہونی چاہیے۔ اس میں بھی تفصیل چاہیے۔ کیونکہ قرات قرآن یا نماز میں ہوگی یا نماز سے باہر ہوگی۔ اگر نماز میں ہے تو فرض میں ہے، واجب میں ہے یا نفل میں ہے تو کیا وہ نماز جماعت سے ادا ہو رہی ہے یا اکیلے نماز پڑھ رہا ہے۔ ان سب صورتوں میں جہری قرات کے الگ الگ احکام ہیں۔

اب رہی بات نماز سے باہر قرات کی تو اس میں احادیث متعارض ہیں کچھ میں تو

---

[1] کانوں میں انگلیاں اس لیے ڈالی جاتی ہیں کہ آواز بلند ہو اور اقامت میں آواز بلند نہیں کی جاتی، لہٰذا انگلیاں ڈالنا مستحب نہیں ہوگا۔ مترجم)

[2] علماء اور قضاۃ علمی کاموں میں بے حد مصروف ہوتے تھے، لہٰذا اقامت سے کچھ دیر پہلے زور سے موذن الصلوۃ الصلوۃ کہتا تھا، تاکہ وہ اب کام چھوڑ کر فوراً جماعت میں شامل ہو جائیں اور انہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔ یہی تثویب ہے۔ مترجم)

تلاوت جہری کی فضیلت ہے اور کچھ میں سری تلاوت کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے۔ امام نووی اور ان کے پیروکاروں نے ان حدیثوں میں یوں موافقت دی ہے کہ احوال و اشخاص کے اختلاف سے (جہر و خفا) میں تبدیلی آتی ہے۔ کئی حضرات ایسے ہیں جن کے لیے خفا و سرا افضل ہے اور کئی لوگ ہیں جن کے لیے جہر اصل و بہتر ہے۔ مثلاً جس آدمی کی ذات ریا اور تکبر وغیرہ سے پاک ہے اور وہاں ایسا آدمی بھی کوئی نہیں جسے اس کی تلاوت سے تکلیف پہنچتی ہو یا وہاں آدمی تو ہے مگر وہ اس کی تلاوت خشوع سے سن رہا ہے تو اس کے لیے جہری تلاوت مستحب ہے ورنہ نہیں۔ اس پر اور باتیں قیاس کر لیجئے۔ ہمارے بہت سارے علماء نے اسی طرح ذکر کیا ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔

ہاں اگر اس نے کسی مخصوص سورہ کے لیے یا کسی اور عمل کے لیے جہر کو لازم قرار دے لیا ہے اور اس مقام پر وہ ایسا ہی کرتا ہے اور شرع میں اس کا کوئی حکم نہیں ہے اور خوف ہے کہ اس کے عمل سے لوگ اسے لازم سمجھیں گے ایسی بہت سی پھیلی ہوئی تخصیصات میں ایسا ہی ہوتا ہے تو پھر جہر میں کراہت ہوگی۔ اس طرح کہ نماز کے بعد بلند آواز سے مل کر فاتحہ کی تلاوت کرنا اسی وجہ سے نصاب الاحتساب میں مکروہ لکھا ہے۔ اس کی یہ مثال بھی ہے کہ فقہاء نے فرمایا وتروں کے بعد سجدۂ شکر مکروہ ہے حالانکہ بذات خود سجدہ شکر مباح اور پسندیدہ ہے اور بھی ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔

فقہاء نے کہا ہے کہ اگر لوگوں کی موجودگی میں کوئی قرآن پڑھ رہا ہو تو اس کے لیے مستحب ہے کہ آیت سجدہ سامعین پر شفقت کرتے آہستہ پڑھے (تاکہ سب پر سجدہ واجب نہ ہو) شاید حاضرین میں سے کوئی بے وضو ہو اور سجدہ اسی وقت ادا نہ کر سکے تو اس طرح وہ کراہیت میں پڑ جائے گا۔ کیونکہ سجدے کو وجوب کے وقت سے پیچھے ادا کرنا مکروہ ہے۔ ہدایہ کی شروح میں ایسا ہی ہے۔ ذخیرہ میں ہے کہ امام محمد فرماتے ہیں حمام میں قرآن پڑھا جا سکتا ہے۔ امام نخعی فرماتے ہیں کہ حمام میں قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔ حقیقتاً یہاں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام نخعی اسی صورت میں کراہت کے قائل ہیں جب لوگ ہوں اور یہ بلند آواز سے قرآن پڑھ رہا ہو اور لوگ قرآن پر توجہ نہ دے رہے ہوں تو اس طرح قرآن

کی تخفیف (ہلکا اور حقیر ہونا) ہوتی ہے (تو پھر قرات مکروہ ہوگی) اگر ایسی حالت ہو تو ہمارے نزدیک بھی مکروہ ہے۔ اسی بنیاد پر ہمارے کچھ علماء نے بازار میں قرات کرنے والے سائل کو بھی کچھ صدقہ دے دینا مکروہ کہا ہے۔

میں نے فقیہ ابو جعفر کے فوائد میں پڑھا ہے کہ حمام یا غسل خانے میں جہاں ایسا پانی موجود ہو جس سے نجاست دھوئی جاتی ہے قرات مکروہ ہے۔ خواہ قرات سری ہو یا جہری۔ [1]

فتاویٰ میں ہے کہ قبرستان میں قرات امام اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاں مکروہ اور امام محمد کے ہاں مکروہ نہیں ہے۔ صدر الشہید کہتے ہیں ہمارے آئمہ نے یہی قول (قول محمد) لیا ہے محمد بن فضل بخاری سے منقول ہے کہ قبرستان میں جہری قرات تو مکروہ ہے مگر خفی اور سری قرات مکروہ نہیں ہے۔

فقیہ حافظ ابو اسحاق اپنے استاذ حضرت ابو بکر محمد بن ابراہیم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ سورۂ ملک قبرستان میں پڑھنے کی کوئی حرج نہیں۔ آہستہ پڑھے یا اونچی پڑھے تو انہوں نے خفا اور جہر میں کوئی فرق نہیں فرمایا۔

کچھ فقہاء نے بلند آواز سے مل کر ختم قرآن کرنا جسے فارسی میں سی پارہ خواندن (تمیں پارے پڑھنا) کہتے ہیں مکروہ ہے۔ [2]

فتاویٰ قاضی خان میں ہے اگر قرآن قبرستان میں اس نیت سے پڑھے کہ قرآن کی

---

[1] حمام وہ بڑی عمارت ہے جس میں کئی غسل خانے ہوں اور مغتسل وہ کمرہ ہے جس میں غسل خانہ بنا ہوا ہو۔ پہلے دور میں ایسے حمام کثرت سے ہوتے تھے ان میں اپنی باری کے انتظار کے لیے جگہیں ہوتی تھیں۔ قرات سے مراد ان انتظار گاہوں میں قرات ہے اس دور میں غسل خانے میں رفع حاجت کی جگہ نہیں ہوتی تھی' وہ پاک صاف ہوتا تھا' تو کیا ایسے کمرے میں قرات جائز ہے یا نہیں؟ کپڑے پہنے ایسے صاف کمرے میں قرات عام فقہاء کے نزدیک جائز ہے ہاں اگر وہاں کسی قسم کی بو ہو یا پلید پانی جمع رہا ہو تو مندرجہ بالا حوالے کے مطابق جائز نہیں ہے 'مکروہ ہے۔ مترجم)

[2] قرآن کوئی پڑھے تو سننے کا حکم ہے جب سب مل کر پڑھنے لگ جائیں تو کوئی بھی سن نہیں رہا تھا لہذا فقہاء میں سے کچھ نے اس بنا پر اسے مکروہ کہا ہے۔ مترجم)

آواز سے انہیں انس پیدا ہو تو پھر اسے پڑھنا چاہیے۔ اگر یہ نیت نہیں تو اللہ تعالیٰ تو اس کی قرات سنتا ہے خواہ وہ جہاں بھی پڑھے (تو پھر جائز ہے)

نماز میں قرات کا حکم

اب رہی نماز میں قرات تو فجر، مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعت میں خواہ نماز وقت میں ہو یا قضا ہو، جمعہ، عیدین، تراویح اور رمضان کے وتروں میں قرات جہری ہو گی اور ان نمازوں میں جہر واجب ہے۔ اگر جہر نہیں کرے گا تو سجدہ سہو واجب ہو گا۔ جب نماز باجماعت ادا کر رہا ہو اگر یہ نمازیں اکیلا پڑھ رہا ہو تو اسے اختیار ہے کہ رات کے نفلوں کی طرح جہر کرے یا سرًا پڑھے ہاں جماعت ہو گی تو جہر واجب ہو گا۔ ظہر اور عصر کے فرضوں میں واجب ہے کہ قرات خفی کرے۔ اسی طرح اگر جہری نماز ایسے وقت میں قضا کر رہا ہے جو سری وقت ہے اور وہ تنہا پڑھ رہا ہے تو جہر نہ کرے۔ صاحب ہدایہ نے اس کی تصیح کی ہے۔ ابن ملک نے شرح المنار میں یہی لکھا ہے۔ بہت سارے فقہاء نے یہاں گرفت کی ہے اور ترجیح اس بات کو دی ہے کہ وہ مختار ہے۔ چاہے جہر کرے، چاہے خفا سے پڑھے۔ دن کو نفل پڑھنے والا آہستہ ہی پڑھے گا اگر بلند آواز سے پڑھے تو یہ مکروہ تحریمی ہو گا۔ بنایہ میں یہی لکھا ہے۔ یہاں بحث بہت طویل ہے۔ اگر خوف اطالت نہ ہوتا تو میں تفصیل سے لکھ دیتا۔

شرح الوقایہ کی شرح کرتے ہوئے انشاء اللہ پوری تفصیل سے بیان کروں گا۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی دو پہلی رکعتوں میں سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے۔ ایک سورۃ ساتھ ملاتے۔ پہلی رکعت میں قرات لمبی ہوتی اور دوسری میں کم ہوتی۔ کبھی کبھار کوئی آیت بلند بھی پڑھ کر لوگوں کو سنا دیتے۔ اسی حدیث سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر امام ایک یا دو آیتیں مقتدیوں کو سنانے اور ان کی تعلیم کی خاطر بلند آواز سے پڑھ دے تو کوئی حرج نہیں۔ اسے جہر نہیں کہیں گے۔ نماز پھر بھی سری ہی رہے گی۔ ہمارے کچھ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے۔ اس سے ہی ملتی وہ صورت بھی ہو گی جو شمس الائمہ حلوائی سے قنیہ میں منقول ہے۔ اگر کسی نے کوئی منکرات دیکھی اور زجر و منع کرتے

ہوئے نماز میں بلند قرات کر دی تو کوئی حرج نہیں ہے۔

(ح) نماز کی تکبیریں بھی جہری ہیں۔ امام اور مبلغ بقدر ضرورت تکبیر بلند کہیں گے تاکہ لوگوں کو پتہ چل سکے کہ اب نماز میں داخل ہو گئے ہیں یا ایک عمل سے دوسرے عمل کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ اسی طرح تسمیع ((سمع اللہ لمن حمدہ) اور سلام بھی بلند آواز سے ادا کریں۔

مقتدی اور منفرد (اکیلا) صرف اپنے جی کو سنائیں گے (یعنی آہستہ پڑھیں گے) ضیا معنوی میں یہی لکھا ہے، لیکن اگر ضرورت سے زیادہ بلند آواز سے قرات ہو گی تو یہ اچھی بات نہیں۔ سراج وھاج میں یہی لکھا ہے۔

شیخ محمد بن محمد غزی کے فتاوی میں ہے کہ امام جب نماز کے لیے تکبیر کہے تو اس کی نماز کی درستگی اور صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ تکبیر سے احرام کی نیت کرے ورنہ نماز نہیں ہو گی۔ اگر مقصد صرف اعلان (لوگوں کو آگاہ کرنا) ہو ہاں اگر احرام و اعلام دونوں کی نیت کر لے تو شرعاً اس سے یہی امر مطلوب ہے۔

"ردالمختار" میں ہے اس کی صورت یوں ہے کہ تکبیر افتتاح (تکبیر تحریمہ) شرط یا رکن ہے تو جو بھی قصد احرام (تحریمہ) کرتا ہے اسے لازماً متحقق کرنا ہو گا لیکن امام کا تسمیع (سمع اللہ لمن حمدہ) اور مکبر کا تحمید (ربنا لک الحمد) کہنا یا دونوں کا منتقل ہوتے تکبیرات کہنا اگر صرف اعلام کے لیے ہو تو نماز نہیں ٹوٹتی۔ سید احمد حموی نے اپنی کتاب "القول البلیغ فی حکم التبلیغ" میں یہی لکھا ہے اور سید محمد ابوالسعود نے حواشی مسکین میں اسی کی تائید کی ہے۔

فرق یہ ہے کہ اعلام کا قصد نماز کا مفسد نہیں ہے۔ مثلاً ایک نمازی تسبیح اس لیے کہتا ہے کہ دوسرے کو پتہ چل جائے کہ وہ نماز میں ہے (تو نماز اس سے نہیں ٹوٹے گی) مطلوب یہ ہے کہ تکبیر ترکیب اور اعلام کے لیے ہے اور جب اس نے صرف اعلام کا ارادہ اور قصد

کیا ہے تو گویا اس نے ذکر ہی نہیں کیا اور تحریمہ کے بغیر ذکر نہ کرنا مفسد نماز نہیں ہے۔

ہم نے اپنے رسالے "تنبیہ ذوی الافہام علی حکم تبلیغ خلف الامام" میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

"فتح القدیر" میں ہے کہ صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کیا آپ مجھے نبی علیہ السلام کے مرض کا ذکر نہیں فرمائیں گی؟ سیدہ نے فرمایا جی ہاں بتاتی ہوں۔ جب سرکار علیہ السلام کا مرض بڑھا تو آپ نے دریافت فرمایا کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے ہم (گھر والوں) نے عرض کیا نماز نہیں پڑھی۔ لوگ تو حضور کے انتظار میں ہیں۔ ارشاد ہوا میرے لیے پانی رکھو۔ پانی گھر والوں نے رکھ دیا۔ آپ نے غسل فرمایا پھر آپ نے اٹھنا چاہا تو آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ جب آرام و افاقہ ہوا تو فرمایا کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے۔ ہم نے کہا نہیں۔ لوگ تو بیٹھے نماز عشاء کے لیے آپ کے منتظر ہیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت ابو بکر کو پیغام بھیجا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ حضرت ابو بکر نے نماز پڑھائی۔ جب حضور کریم کو اپنی جی میں مرض کی کمی کا احساس ہوا آپ دو آدمیوں کے درمیان پاؤں مبارک گھسیٹتے (نماز کے لیے مسجد کی طرف) نماز ظہر کے لیے نکلے۔ ان دو حضرات میں سے ایک حضرت عباس تھے۔ [1]

اور صدیق اکبر نماز پڑھا رہے تھے۔ جب حضور علیہ السلام کو دیکھا تو پیچھے ہٹنا چاہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ پیچھے نہ ہٹیں۔ دونوں صحابہ کو فرمایا مجھے ابو بکر کے پہلو میں بٹھا دو۔ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو کھڑے نبی علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ حضرت ابو بکر کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ سرکار علیہ التسلیم بیٹھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔

امام ترمذی نے حضرت عائشہ سلام اللہ علیہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اقدس

---

[1] لہذا تحریمہ کے لیے مذکورہ بالا چیزوں میں صرف اعلام کے قصد سے نماز فاسد نہیں ہو گی۔ (مترجم)

علیہ السلام نے اپنی اس بیماری میں جس میں آپ کا وصال مبارک ہوا، حضرت ابو بکر کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح کہا ہے۔

امام نسائیؒ نے حضرت انس سے روایت لی ہے کہ سرکار کریم علیہ التسلیم نے جو آخری نماز لوگوں کے ساتھ پڑھی، وہ ایک کپڑے میں تھی۔ آپ نے کپڑا لپیٹا ہوا تھا اور صدیق اکبر کے پیچھے نماز پڑھی تھی۔ صحیحین کی حدیث سے اولاً یہ حدیث معارض نہیں ہے۔ ثانیاً بیہقی بھی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیحین والی حدیث سے متعارض نہیں ہے۔ کیونکہ جس نماز میں سید کل علیہ السلام تھے، وہ ہفتے یا اتوار کی نماز ظہر تھی اور جس نماز میں آپ ماموم (مقتدی) تھے وہ سوموار کی صبح کی نماز تھی۔ دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے یہ آپ کی آخری نماز تھی۔

اعمش فرماتے ہیں کہ سیدہ عائشہ کے اس قول کا مطلب "کہ لوگ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے" یہ ہے کہ وہ سید کل علیہ السلام کی تکبیر لوگوں کو سنا رہے تھے۔ [1]

درایہ میں ہے کہ جمعہ اور عیدین وغیرہ میں موذن کا اذانوں میں آواز کو بلند کرنے کا جواز معلوم و معروف ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد وہ خصوصی بلند آواز نہیں ہے جو ہمارے دور میں ہے بلکہ اس سے مراد اتنی ہی بلند آواز ہے جس سے امام کا ایک عمل سے دوسرے عمل کی طرف منتقل ہونے کا پتہ چل سکے۔ مگر جس انداز سے ہمارے دور میں مکبر امام کے پیچھے چلا کر تکبیر کہتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ کچھ بعید نہیں کہ اس سے نماز ٹوٹ ہی جائے۔ ان کی تکبیر میں تو اللہ اکبر ہمزہ پر (الف) مد ہوتا ہے یا اکبر کی یا پر مد پڑھ دیتے ہیں۔ اس سے تو نماز ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر یہ لوگ تو ابلاغ و اطلاع کی حد سے بڑھ کر پوری شدت سے چلاتے ہیں اور نغمے اور گیت کے انداز سے آواز کو سجانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ نغمات کلام اور چیخ دونوں کیفیات پیدا کر دیتے ہیں۔ آگے باب ما یفسد الصلوۃ (وہ چیزیں جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے) میں یہ بات موجود ہے کہ اگر جنت اور دوزخ کے ذکر

---

[1] یعنی وہ آپ کی نماز کے مکبر تھے۔ مترجم)

میں رونے کی آواز بلند ہو جائے تو نماز نہیں ٹوٹتی۔ اگر مصیبت کی وجہ سے رونے کی آواز بلند ہو جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ کیونکہ پہلی صورت میں جنت کے سوال کا تعرض اور جہنم سے تعوذ (پناہ) ہے اور دوسری صورت میں مصیبت کا اظہار ہے۔ اگر تصریح کرتے ہوئے کہہ دیا وامصیتاہ (ہائے مصیبت) یا کہا ادرکونی (مجھے پالو' میری مدد کرو) تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ وہ ایسے الفاظ کہہ کر لوگوں کو تعجب میں ڈالنا چاہتا ہے۔ (اس سے مراد موذن ہے) یہ موذن بھی جو الفاظ پیدا کرتا ہے وہ اس مصیبت زدہ کے الفاظ سے مشابہ ہیں جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اگر اس موذن نے بھی مصیبت زدہ کی طرح یہ الفاظ کہہ دیے کہ میری اچھی آواز سے حیران ہو جاؤ تو لازماً نماز ٹوٹ جائے گی۔ جہاں بھی لحن آتا ہے' وہاں لازماً حروف پیدا ہو جاتے ہیں تو بھلا جو شخص دعا اور سوال کا معنیٰ سمجھتا ہے' اس سے ایسی حرکات کب صدور پذیر ہو سکتی ہیں۔ یہ تو ایک انداز کا لہو و لعب ہے۔

صاحب النہر اور صاحب در مختار نے اس کی تائید کی۔ صاحب الحلیہ نے اس کی تحسین فرمائی۔ سید احمد حموی نے قول بلیغ میں اس کی گرفت فرمائی کہ انہوں نے السراج میں تصریح کی ہے کہ جب امام نے ضرورت سے بڑھ کر آواز بلند کی تو اس نے خلاف ادب کیا اور بے ادبی کراہیت سے کم ہے۔ اس سے نماز نہیں ٹوٹتی' رونے پر بھی اس کو (تکبیر کو) قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ایک صیغہ کے ذریعے ذکر ہے جسے اس کے ارادے سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور نماز کا مفسد تو بولا ہوا لفظ ہوتا دل کا ارادہ نہیں۔ پھر قیاس اس لیے نہیں ہو سکتا کہ قیاس چار صدیوں کے بعد سے منقطع ہے۔ اس کے بعد کسی کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں کہ ایک مسئلے کو دوسرے مسئلے پر قیاس کرتا رہے۔ جیسا کہ ابن نجیم نے اپنے رسائل میں ذکر کیا ہے۔[1]

---

[1] ہمیں اس عبارت سے اتفاق نہیں ہے' مگر تفاصیل کے لیے طویل بحث کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اپنی بات ضرور عرض کریں گے کہ اجتہاد اور قیاس اس لیے ضروری ہے کہ نئے مسائل پیدا ہونے کی صورت میں ان کا حل درکار ہے' اور یہ حل قیاس و اجتہاد کے ذریعے ہی نکالا جا سکتا ہے۔ شاید کسی ایسی عبارت سے متاثر ہو کر مشہور مغربی مفکر پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب دی لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی چوتھی جلد میں کہا کہ اب اہل سنت اجتہاد کے منکر ہیں اور انہوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا ہے' یعنی یہ انگریز مفکر تعجب کر رہا ہے کہ وہ پھر نئے مسائل کا حل کہاں سے نکالیں گے۔ مترجم)

ابن العابدین نے اس گرفت کا جواب اپنے رسالے "تنبیہ الافہام علی حکم التبلیغ
خلف الامام" اور دوسری تصانیف میں دیا ہے کہ علامہ کمال نے صرف بلند آواز کرنے کو
فساد نماز کی بنیاد قرار نہیں دیا کہ ان میں وہ اعتراض وارد ہو جو سراج میں ہے بلکہ ان کے
نزدیک تو وہ آواز مفسد ہے جو صیاح (واویلا اور چیخنا) اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ رہی
حموی کی بات "کہ اس کو رونے پر قیاس کیا جائے" ساقط الاعتبار ہے کیونکہ انہوں نے جو
کچھ کہا ہے وہ امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ کو ارشاد ہے۔ انہوں نے اس پر نماز نہ ٹوٹنے کی
بنیاد رکھی ہے۔ اس صورت میں کہ جب نمازی اپنے امام کے بغیر کسی اور کو لقمہ دے دے
یا موذن کے کلمات کا جواب دے یا اسے کوئی خوش کن خبر دی گئی تو اس نے الحمدللہ کہہ دیا
ایسی کوئی اور بات ہوئی لیکن مذہب حنفی تو ان سب صورتوں میں نماز ٹوٹنے کا حکم دیتا ہے
اور صاحبین کا قول بھی یہی ہے کیونکہ یہ تعلیم و تعلم اور خطاب و جواب ہے۔

ذکر اگر پوری عزیمت سے بھی ہو تو وہ احکام کو نہ بدلے ممنوع اور ناقابل تسلیم
ہے۔ آپ ملاحظہ نہیں فرماتے کہ جنبی جب الحمد للہ رب العالمین شکر و ثنا
کے ارادے سے پڑھے تو جائز ہے۔ صاحبین" کے نزدیک فساد کا مدار اس بات پر ہے کہ لفظ
ایک ایسے معنی کا فائدہ دے جو اعمال نماز سے نہیں ہے تو پھر یہ قاعدہ و کلیہ بن گیا جس کے
تحت کئی جزئیات آگئیں اور زیر بحث مسئلہ بھی اس میں آگیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب نمازی نے ذکر کا قصد تو نہیں کیا لیکن صیاح و چلانے
میں اس لیے مبالغہ کیا کہ ایک اعلیٰ نغمہ بھی پیدا ہو اور لوگ بھی اس سے متعجب ہوں تو اس
نے اس سے ایک ایسے معنی کا فائدہ لیا ہے جو نماز کے اعمال میں شامل نہیں ہے۔

یہ ایسا قیاس نہیں ہے جو اب ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ تو مجتہد کے کلام کے ضمن میں
آنے والی بات کی تصریح ہے یا کلام مجتہد۔ اس پر دلالت مساوات کے طور پر خود دلالت کرتا
ہے۔

(ط) جہری مقامات میں سے خطبہ بھی ہے۔ وہ جمعے کا خطبہ ہو، عیدین کا خطبہ ہو یا نکاح
وغیرہ کا خطبہ ہو۔ متوارث (یکے بعد دیگرے ...... والی بات) یہی ہے کہ خطیب
خطبہ بلند آواز سے پڑھتا ہے۔ اللہ کریم کا یہ ارشاد "اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید

و فروخت چھوڑو" اسی جہری ذکر پر دلالت کرتا ہے۔ بہت ساری قولی و فعلی احادیث بھی اس بات کی گواہ ہیں لیکن دوسرے خطبے میں پہلے سے کم جہر کرے۔ (یہی در مختار میں ہے)

(ی) جہری مقامات میں تکبیرات تشریق بھی شامل ہیں۔ امام اور اس کے مقتدی مرد بلند آواز سے یہ تکبیریں کہیں گے۔ ہاں عورت آہستہ کہے گی۔ یہ تکبیریں عرفہ کی صبح (۹ ذی الحجہ کی صبح) سے لے کر عید کی عصر یا ایام تشریق کے آخری دن تک جاری رہیں۔ دونوں اقوال کے اختلاف کے مطابق بات ہو گی۔ (ایک قول عید کی عصر تک ہے اور دوسرا ایام تشریق کے خاتمے تک ہے) مختار یہی آخری قول (ایام تشریق کے آخر تک) ہے کیونکہ محدث ابن ابی الدنیا نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب عرفہ کی صبح کی نماز پڑھتے تو گھٹنے اٹھاتے ہی فرماتے اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد ایام تشریق کے آخری دن کی عصر تک آپ اسی طرح کرتے۔

محدث ابن ابی شیبہ، ابن ابی الدنیا اور حاکم نے عمیر بن سعد سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمارے ہاں تشریف لائے تو وہ عرفہ کی صبح سے لے کر ایام تشریق کے آخری دن کی عصر تک یہ تکبیر کہتے تھے۔

ابن ابی شیبہ اور حاکم نے شفیق رضی اللہ عنہ سے روایت لی ہے کہ سیدنا حیدر کرار رضی اللہ عنہ عرفہ کی صبح کی نماز کے بعد تکبیر کا آغاز فرماتے پھر ایام تشریق کے آخری دن کی عصر تک اسے جاری رکھتے۔

ابن ابی شیبہ، مروزی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ اس سے صاحب ہدایہ کا یہ استدلال جو کہ امام اعظم کے ہاں بلند آواز سے تکبیر کہنا بدعت ہے لہذا آمل کیا جائے" بالکل ضعیف ہو گیا کیونکہ اتنی احادیث و آثار وارد ہیں کہ ایام تشریق کے آخر تک جہراً تکبیر کہی جائے پھر بدعت کا کوئی معنی نہ رہا۔ [1]

---

[1] اس سے ثابت ہوا کہ تکبیر میں جہر جائز ہے اور یہ بدعت نہیں تو صاحب ہدایہ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے جو حضرات آج تک بدعت کی رٹ لگائے ہوئے ہیں انہیں اپنے طرز عمل پر نگاہ ثانی کرنی چاہیے، کیونکہ حدیث کے مقابلے میں صاحب ہدایہ کا استدلال قائم نہیں رہ سکتا۔ مترجم)

مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "گنتی کے دنوں میں اللہ کا ذکر کرو" کی تفسیر میں
فرمایا کہ اس سے یہی تکبیر مراد ہے۔

احتیاط یہ ہے کہ عبادات میں اکثر کو لیا جائے کم کو نہیں۔ یہ کوئی مخفی بات نہیں ہے[1]
عید الاضحیٰ کے دن نماز کے لیے جاتے ہوئے راستے میں بھی جہراً تکبیر کہی جائے گی۔
کیونکہ آثار (حدیث و عمل صحابہ) میں یہی آتا ہے۔

ان دس دنوں میں بازاروں میں بھی کیا بلند آواز سے تکبیر کہی جائے؟ ہمارے کچھ
علماء نے کہا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کچھ علماء نے فرمایا کہ ان دس دنوں میں تکبیر کہنا
حسن (اچھی بات) ہے۔ کیونکہ حضرت عبد اللہ بن عمرو غیرہ سے اس سلسلہ میں اثر منقول
ہے۔

جامع التفاریق میں ہے کہ سیدنا امام اعظم سے سوال کیا گیا کیا اہل کوفہ کے لیے
مناسب ہو گا کہ تشریق کے دنوں میں بازاروں اور مساجد میں تکبیریں کہیں؟ تو آپ نے فرمایا
جی ہاں (مناسب ہے) [2]

فقیہ ابو اللیث کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بن یوسف ایام تشریق میں بازاروں میں
تکبیرات پڑھنے کا فتویٰ دیتے تھے۔

ابو جعفر ھندوانی فرماتے ہیں میرے نزدیک یہ نامناسب ہے کہ عوام کو اس عمل سے
روکا جائے۔ کیونکہ نیکی میں ان کی رغبت ویسے بھی کم ہوتی ہے (اگر روک دیا گیا تو اس نیکی
سے بھی رہ جائیں گے) بنایہ میں ہے کہ ہمارا بھی اسی پر عمل ہے۔ [3]

---

1. اکثر یہ ہے کہ ایام تشریق کے آخر تک تکبیر جاری رہے لہٰذا اس پر عمل کیا جائے اور اقل یہ ہے
عید کی عصر تک تکبیر کہی جائے۔ اس پر عمل نہ ہو۔ مترجم)

2. اس روایت سے ثابت ہو گیا کہ امام اعظم نمازوں کے بعد ہی نہیں ' بلکہ عام اوقات میں بھی
مسجدوں اور بازاروں میں تکبیر جہراً پڑھنے کی اجازت فرما رہے ہیں ' لہٰذا اسے ان کے حوالے سے
بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ مترجم)

3. خلاصہ عبارات یہ ہوا کہ ہر وہ عمل جو حسن ہے اس سے نہ روکا جائے اور یہی ائمہ کا معمول
ہے۔ ایسی باتوں سے روکنا دراصل نیکی سے روکنا ہے اور یہ جائز نہیں ' اس سے کئی مسائل حل
جاتے ہیں اور کئی جھگڑے نمٹ جاتے ہیں۔ اللہ کریم سے توفیق کی درخواست اور التجا ہے۔ مترجم)

کیا عید الفطر کے دن نماز عید کے لیے جاتے ہوئے راستے پر جہرا تکبیر کہہ سکتا ہے؟
صاحبین کہتے ہیں کہہ سکتا ہے۔ امام اعظم کا ارشاد ہے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اذکار میں اصل اخفا (سرا کہنا) ہے۔ صرف وہاں ہی جہر ہو گا جہاں شریعت کہے گی۔ آئمہ ثلاثہ کے درمیان اسی طرح اس مسئلے میں اختلاف ان کتابوں میں مذکور ہے۔

البدائع، السراج الوھاج، ردالمختار، ملتقی الابحر، الدرر، الاختیار، مواھب الرحمان، تاتار خانیہ، التجنیس، مختارات النوازل، الکفایہ، المعراج، زاد الفقہاء، غایۃ البیان اور بنایہ وغیرہ کتب معتبرہ طحطاوی کی مراقی الفلاح کے حواشی میں ہے۔ علامہ حلبی فرماتے ہیں دراصل یہ اختلاف جہر کے مستحب یا غیر مستحب میں ہونا چاہیے۔ کراہیت یا عدم کراہیت میں نہیں۔ کیونکہ جہر عید الفطر میں بہت سے اسلاف سے منقول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابن عمر، ابوامامہ، نخعی، عمر بن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، حکم حماد، طالب شافعی، احمد اور ابوثور سب تکبیر میں جہر کرتے تھے۔ (لہٰذا اختلاف مستحب اور عدم مستحب میں ہونا چاہیے) یہ ابن المنذر نے اپنی کتاب "الاشراف" میں لکھا ہے۔

"خلاصہ" میں ہے کہ فطر کے دن تکبیر نہ کہے۔ صاحبین فرماتے ہیں کہ آہستہ تکبیر کہے۔ امام اعظم سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے لیکن زیادہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا یہ ہے کہ عید الفطر میں تکبیر نہ کہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف اصلی تکبیر میں ہے۔ صفت تکبیر (بلند یا آہستہ) میں نہیں اور بلند آواز سے نہ پڑھے یہ تینوں آئمہ کا اتفاق ہے۔ ابن الہمام نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں کیونکہ اللہ کے ذکر سے کسی وقت بھی روکا نہیں جا سکتا۔ ہاں ذکر بدعت کے انداز سے کرنے سے روکا جاتا ہے۔ [۱]

ابن اسیر ھاج حلیۃ المحلی میں ابن الہمام سے متفق ہو کر لکھتے ہیں کہ عید الفطر کی تکبیرات میں اختلاف ہے۔ امام اعظم سے مروی ہے یہی آپ کے صاحبین سے بھی مروی ہے۔ طحطاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ تکبیر جہر سے کرے۔ امام اعظم سے بھی روایت

---

[۱] تو عید الفطر میں تکبیرات سے روکنا جائز نہیں، لہٰذا صاحب خلاصہ کی تحقیق درست نہیں۔ مترجم)

ہے کہ آہستہ پڑھے۔

النصاب کے مصنف نے بڑی عجیب وغریب بات کہی کہ دونوں عیدوں میں تکبیرات آہستہ کہے۔ جس نے امام اعظم کی طرف یہ بات منسوب کی کہ عید الفطر میں بالکل تکبیرات نہ کہے۔ اس نے بھی نرالی اور عجیب بات کی۔ پھر اس پر مزید یہ گل کھلایا کہ یہ بات ہی ا... ہے۔ خلاصہ میں ظاہری عبارت یہی ہے۔

(ک) جہری مقامات میں تلبیہ (لبیک اللھم لبیک الخ کا پڑھنا) بھی ہے۔ احرام والا یہ تلبیہ بلند آواز سے پڑھے گا۔ ابوداؤد' نسائی' ترمذی' (ترمذی نے اسے صحیح کہا) ابن ماجہ' امام احمد بن حنبل' ابن حزیمہ اور امام حاکم (انہوں نے صحیح بھی کہا) نے خلا... ابن سائب سے روایت کیا۔ انہوں نے اپنے والد (سائب) سے مرفوعاً روایت کیا کہ میرے پاس (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) جبرئیل آئے اور مجھے کہا کہ میں اپنے صحابہ کو حکم دوں کہ تلبیہ اور احرام کے وقت آواز بلند کریں یہ شعائر حج میں شامل ہے۔ یہ روایت امام مالک' امام شافعی اور حضرت ابن شیبہ نے بھی   کی ہے۔

ابن ماجہ' ابن خزیمہ' ابن ابی شیبہ' ابن حبان اور حاکم (حاکم نے اسے صحیح کہا) نے مرفوعاً زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میرے پاس جبرئیل آئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو حکم دیں کہ وہ بلند آواز سے تلبیہ کہیں۔ کیونکہ یہ شعائر حج ہے۔ تلبیہ بلند آواز سے کہنا ایک **منقول** امر ہے۔ جس کا نبی علیہ السلام کے ظاہری حیات سے لے کر آج تک کسی نے انکار نہیں کیا ہے۔

ہدایہ میں ہے تلبیہ بلند آواز سے کہے۔ کیونکہ سید کل علیہ السلام نے فرمایا کہ سب سے افضل حج وہ ہے جس میں عج وثج ہو۔ عج کا معنی بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور ثج کا مطلب قربانی کا خون بہانا ہے۔ "فتح القدیر" کے مصنف فرماتے ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تلبیہ میں بلند آواز کرنا سنت ہے۔ اگر اسے چھوڑے گا تو گنہگار ہو گا لیکن اس کے علاوہ اس پر کوئی تاوان وغیرہ نہیں ہے لیکن آواز بلند کرنے میں حد سے بھی نہ بڑھے۔ اس طرح اس کی جان تھک جائے گی اور ضرور تکلیف ہو گی۔

ہمارے اس قول کہ "اپنے جی کو مشقت میں نہ ڈالے" اور ان دلیلوں میں جن...

شدت سے آواز بلند کرنے کا حکم ہے اور یہی توعج کا معنی بھی کہ آواز خوب بلند ہو---- میں کوئی منافات اور باہمی خلا اور مخالفت نہیں ہے۔ کیونکہ آواز بلند کرنے اور مشقت میں پڑنے میں لزوم نہیں ہے۔ (کہ جو آواز بلند کرے وہ ضرور تھک جائے گا) کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی آواز فطرتاً بلند ہوتی ہے۔ اس سے آواز تو اونچی ہو جاتی ہے مگر وہ تھکتا نہیں ہے۔

(ل) جہر کے مقامات میں سے ایک لوگوں کو سلام کرنا اور لوگوں کے سلام کا جواب دینا بھی ہے اگر سلام اس طرح آہستہ کہا کہ کسی نے سنا ہی نہیں ہے تو یہ سنت نہیں ہوگا۔ مردوں کو اگر سلام کہا جائے تو بھی بلند آواز سے ہونا چاہیے تاکہ وہ سن کر جواب دیں۔ احادیث میں ایسا ہی آیا ہے۔ [1]

(م) چھینک والے کا جواب (یرحمک اللہ) بلند آواز سے کہنا بھی ضروری ہے۔ خانیہ میں مذکور ہے سلام کا جواب دیتے ہوئے اور چھینک کا جواب دیتے ہوئے اپنے مخاطب کو آواز سنانا شرط ہے آواز نہ سنا سکے (مثلاً وہ بہرا ہو) تو ہونٹ ہلا دے۔

(ن) قنیہ میں ہے جہراً تکبیر صرف ایام تشریق میں ہے۔ ہاں دشمن اور چوروں کے مقابلہ میں بھی بلند تکبیر کہہ سکتے ہیں۔ کچھ حضرات نے اس پر چلنے والے اور خوفناک حالتوں والے لوگوں کا قیاس کرتے ہوئے وہاں بھی تکبیر جائز کہی ہے۔ بنایہ وغیرہ میں اسی طرح مذکور ہے۔

(س) بلند تکبیر کا ایک مقام وتروں سے فارغ ہو کر بلند تسبیح کہنے کا ہے۔ یہ بھی حدیث میں موجود ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

---

[1] معلوم ہوا کہ مردے برزخ کی دنیا میں زندہ ہوتے ہیں' لہٰذا بلند آواز سے قبرستان میں سلام کہنا ضروری ہے۔ احادیث میں اسی طرح وارد ہے' ظاہر پرست اور عقل کے پجاری جو کچھ بھی کہتے رہیں سنت نے ہمیں بتایا کہ مرنے والے تمہاری آواز کو سنتے ہیں' جواب دیتے ہیں اور پہچانتے ہیں جسے دنیا میں جانتے تھے اسے وہاں بھی جانتے ہیں' یہی ملت کا چودہ سو سال سے عقیدہ ہے اور یہی رہے گا' کیونکہ ملت کے ہاں عقل معیار نہیں' سید کل علیہ السلام معیار ہیں۔ مترجم)

تتمہ و تکمیل

بلند آواز سے ذکر و قرات جنازہ لے کر جانے والوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے مکروہ تحریمی ہے اور بعض اسے مکروہ تنزیہی کہتے ہیں۔ ان کے لیے مناسب یہ ہے کہ طویل خاموشی رکھیں۔ اگر ذکر کرنا بھی چاہیں تو جی میں ذکر کریں۔ "فتح القدیر" وغیرہ میں اسی طرح لکھا ہے۔ "رد المختار" میں ہے جب دعا اور ذکر میں یوں ہے تو آپ کا اس غنا کے متعلق کیا خیال ہے جو اس دور کی پیداوار ہے؟ "الجوھر القفیہ شرح الدرۃ المنفیہ" میں ہے بلند آواز سے ذکر نہ کرے۔ یعنی ذکر قرات اور تکبیر جنازے کے پیچھے مکروہ ہے۔[1]

اس مقصد میں اب کلام ختم ہوا۔ جلال و اکرام والے اللہ کریم کے لیے حمد ہے اور درود مخلوق کے آقا اور ان کی آل اور صحابہ کرام پر ہے۔

---

[1] ابھی پیچھے ابو جعفر ہندوانی کی روایت سے گزرا کہ عمل حسن سے عوام کو نہ روکا جائے، چونکہ ذکر خلف جنازہ عمل حسن ہے، لہٰذا اس سے روکنا اچھا نہیں ہوگا، ایک حدیث بھی پیچھے گزری ہے، کہ جو ذکر سنتے ہیں وہ قیامت کو گواہی دیں گے لہٰذا اس ذکر کی بھی گواہی ہوگی کہ فلاں مرا تو ذکر ہو اس کے اسلام کی یہ گواہی ہوگی۔ مزید بر آں اگر یہ بدعت ہی قرار پائے تو یہ بدعت حسنہ ہوگی، لہٰذا اس سے روکنا اچھا نہیں ہوگا۔ قبروں میں جا کر مردوں کو سلام کہنے کے بارے میں بھی پیچھے گزرا کہ وہ ذرا بلند آواز سے ہو تاکہ وہ سن سکیں۔ یہاں بھی وہ مردے کو اٹھا کر لے جا رہے ہیں اور بلند آواز سے ذکر کر رہے ہیں، تاکہ وہ سن سکے اس طرح وہ مرنے والے کو تلقین کر رہے ہے اور تلقین کا ذکر خود حدیث میں موجود ہے۔ جب ذکر خلف جنازہ کے اتنے فائدے ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی کئی فائدے ہیں تو نہ یہ بدعت ہو سکتا ہے اور نہ ہی مکروہ، بلکہ فعل حسن ہے۔ اس میں صرف ذکر و تلاوت ہے، ہاں یہ ضرور احتیاط ہونی چاہیے کہ کوئی غیر شرعی فعل اس میں نہ ہو اور واضح بات ہے کہ غیر شرعی فعل تو ہر حال اور ہر صورت میں ناجائز ہے وہ خواہ جنازے کے ساتھ ہو یا کسی بھی اور محفل میں ہو۔ مترجم)

قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِیْ صَغِیْرًا

اسلام اور احترامِ والدین

تالیف

مفتی محمد خان قادری

جامعہ رحمانیہ شادمان لاہور

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

رضاعی مائیں اور رضاعی بھائی، بہنیں

تالیف

مفتی محمد خان قادری

عالمی دعوتِ اسلامیہ پنجاب

مؤلفات الإمام اللكنوي

٤

سباحة الفكر في الجهر بالذكر

للإمام أبي الحسنات محمد عبد الحي اللكنوي الهندي

ولد ١٢٦٤ وتوفي ١٣٠٤هـ

رحمه الله تعالى

اعتنى به

عبد الفتاح أبو غدة

الناشر

مكتب المطبوعات الإسلامية بحلب

باب الحديد - مكتبة النهضة - ت ٣٥٢٩١

بسم الله الرحمن الرحيم

تقدمة الكتاب:

الحمدُ لله حمدَ الشاكرين الذاكرين، والصلاةُ والسلام على سيدنا محمد سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وصحبه أجمعين، والتابعين لهم بإحسان إلى يوم الدين.

أما بعدُ فهذه رسالة لطيفة، تُسمَّى «سِبَاحَة الفِكر في الجهر بالذكر»، نافعةٌ مفيدةٌ في بابها، ألَّفها الإمام العلاّمة المحقق الشيخ محمد عبدالحي اللَّكْنَوي الهندي، المولود سنة ١٢٦٤ من الهجرة، والمتوفى سنة ١٣٠٤، عن ٣٩ سَنَةً وأربعةِ أشهر، ونحوِ مئةٍ وخمسةَ عشرَ مؤلَّفاً، بين رسالةٍ في صفحات، وكتابٍ ضخم في مجلدات، وفي أهم المباحث وأصعبِ الموضوعات.

وقد عُرِفَ رحمه الله تعالى بالتحقيقِ والاستيفاءِ والدقةِ وعمقِ البحث والنَّصَفةِ والاعتدالِ في كلِّ ما يؤلِّفه، سواء كان ما يؤلِّفه في المذهب الحنفي الذي هو إمامٌ من أئمته المتأخرين، أم في غيره من المباحث الفقهية العامة أو الحديثية الشائكة، ولهذا تلقَّى أهلُ العلم مؤلَّفاتِه بالقبول والثناء والتقدير.

وكنتُ ترجمتُ له ترجمةً حافلةً شاملة، في أول كتابه الفَذِّ الفريد: «الرَّفْع والتكميل في الجَرْح والتعديل»، الذي هو أوَّلُ كتاب أُلِّفَ في موضوعه، ولم يُسبَق إليه، على تمادي العصورِ ووفرةِ الحُفَّاظِ النُّقَّادِ المؤلِّفين في علوم الحديث، فأُحيلُ القارىءَ المستزيدَ لمعرفة هذا المؤلِّفِ النابغةِ الهُمَام، إلى قراءةِ ترجمتِه هناك.

وقد سَبَقه إلى التأليف في الجهر بالذكر الإمامُ السيوطي رحمه الله تعالى، فألَّف رسالة سَمَّاها «نتيجة الفِكر في الجهر بالذكر»، وَقف عليها الإمام اللكنوي،

وطُبِعَتْ أكثر من مرة ضمن الجزء الثاني من كتاب «الحاوي للفتاوي» للإمام السيوطي، ولكن رسالةَ الإمام اللكنوي هذه أدقُّ وأشمل، وأجمع وأكمل، فقد حقَّق فيها تعريفَ الجهر والسرّ، ثم عَرَض أدلةَ المانعين للجهر، ثم ذَكَر الجوابَ عنها، وأوردَ أدلةَ المجيزين، واستوعب فيها واستَقصَى ما استطاع، واستَدلَّ ببعضها على استحباب الجهر كما أشار إلى ذلك في موضعه، ثم تعرَّض لبيان المواضع التي يُطلَبُ فيها الجهرُ بالذكر، أو يُكره.

ورسالة اللكنوي هذه طُبِعَت في بلاد الهند أربع طبعات، بالطباعة الحجرية الهندية القديمة، فطُبِعَتْ في حياة المؤلف رحمه الله تعالى، في مطبع دبدبة أحمدي سنة ١٣٠٣ في مدينة لكنو بالهند، ضمن مجموعة من رسائله النفيسة النادرة، عُرِفت باسم «مجموعة الرسائل الست».

وتلك الرسائل هي:

١ ـ الهَسْهَسَة بنقض الوضوء بالقَهْقَهَة.

٢ ـ خيرُ الخَبَر في أذان خَيْر البَشَر.

٣ ـ سِبَاحة الفِكر في الجهر بالذكر.

٤ ـ النافع الكبير لمن يطالع الجامع الصغير ـ يعني: الجامع الصغير للإمام محمد بن الحسن الشيباني ـ.

٥ ـ رفع السِّتر عن كيفية إدخال الميت في القبر.

٦ ـ طَرَبُ الأماثل بتراجم الأفاضل.

ثم طُبِعَتْ في المطبع اليوسفي بلكنو أيضاً سنة ١٣٢٠، ثم في سنة ١٣٢٢، ثم في سنة ١٣٤٠، وعن هذه الطبعة ـ وفيها تحريفات كثيرة وأخطاء وسَقْط ـ أنشُرُ هذه الطبعة مجتهداً في تصحيحها، وقد نَفِدَتْ هذه الطبعات كلُّها في حينها من أكثر من ستين سنة، ولم يصل منها إلى البلاد العربية إلا النَّزْرُ اليسيرُ من النُّسَخ، فلذا يمكن أن تُعَدَّ هذه الرسالة وأخواتُها في عداد النُّسَخ المخطوطة، لندرةِ وجودها وصعوبةِ الحصول عليها.

فلذا رأيتُ طبعَها في البلاد العربية ـ في ضمن مؤلَّفات الإمام اللكنوي ـ، بالحروف الناضرة، والإخراج الجميل، والعناية اللائقة، والتعليق الوجيز، لتزيدَ

الاستفادةُ منها، فخرَّجتُ أحاديثَها مع بيان مرتبتها من الصحة أو الضعف بحسب ما تيسَّر لي عند قراءتها، لأهميتها إذ هي عِمادُ الموضوع، وأغفلتُ تعيين إحالة النصوص الفقهية إلى مواضعها ليُسر أمرِها، وضبطتُ كثيراً من العبارات بالشكل، وفصَّلتُ مقاطعها وجُمَلها، لتكون أيسرَ قراءةً وفهماً إن شاء اللَّه تعالى. وقدَّمت بين يدي الرسالةِ الكلمةَ التالية:

كلمةٌ حولَ الذكر المشروع، والذكر الممنوع:

ذكرُ اللَّه تعالى باللسان أو الجَنان: رَيحانُ قلوب المؤمنين، وبَلْسَمُ نفوسهم، وشِفاءُ صدورهم من الأمراض والأعراض والأحزان والأكدار، ورُكنٌ عظيمٌ من أركانِ حسناتِهم وصالح أعمالِهم.

ومن أجل هذا أمَرَ اللَّه تعالى المؤمنين بذكره سبحانه، فقال جل شأنه: ﴿يا أيها الذين آمَنُوا اذكُرُوا اللَّهَ ذِكْراً كثيراً * وسَبِّحُوه بُكْرَةً وأَصِيلاً﴾[١].

ومن أجل هذا أيضاً قال النبي صلى اللَّه عليه وسلم ما رواه عنه أبو هريرة رضي اللَّه عنه: «من قَعَد مقعداً لم يَذكُر اللَّه فيه، كانت عليه من اللَّه تِرَة[٢]، ومن قام مقاماً لم يَذكُر اللَّه فيه، كانت عليه من اللَّه تِرَة، ومن اضطجع مضجعاً لم يذكر اللَّه فيه، كانت عليه من اللَّه تِرَة»[٣].

وجاء عن عبداللَّه بن عَمْرو بن العاص رضي اللَّه عنهما، قال: قال رسول اللَّه صلى اللَّه عليه وسلم: «ما من قومٍ جلسوا مجلساً لم يذكروا اللَّه تعالى فيه، إلا رأَوْه حَسْرَةً يوم القيامة»[٤].

---

(١) من سورة الأحزاب، الآية ٤١ و ٤٢.

(٢) أي حسرةٌ وندامة، ونقصٌ وخَسارة، لفواتِ فضلِ اللَّه وعطائِه، بتركِ الذكر للَّه سبحانه فيه.

(٣) رواه أبو داود في «سننه» ٤: ٣٦٥، بسندٍ حسن، في كتاب الأدب (باب كراهِيَة أن يقوم الرجل من مجلسه ولا يذكر اللَّه)، وكذا رواه النسائي في كتاب «عمل اليوم والليلة» ص ٣١١، واللفظُ المذكور من كتاب النسائي.

(٤) رواه الإمام أحمد في «المسند» ٢: ٢٢٤ بإسنادٍ صحيح.

وجاء عن أبي الدرداء رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «ألا أنبئكم بخيرِ أعمالكم وأزكاها عند مليككم، وأرفعِها في درجاتكم، وخيرٍ لكم من إعطاءِ الذهبِ والوَرِق[١]، وخيرٍ لكم من أن تلقَوْا عدوَّكم فتضربوا أعناقَهم ويضربوا أعناقكم؟ قالوا: وما هو يا رسول الله؟ قال: ذكرُ الله عزَّ وجل. فقال معاذ بن جبلَ رضي الله عنه: ما شيءٌ أَنْجى من عذابِ الله تعالى من ذكرِ الله»[٢].

قال الإمام ابن القيم رحمه الله تعالى، في كتابه «زاد المعاد»[٣] في (فصل في هَدْيه صلى الله عليه وسلم في الذكر):

«كان النبي صلى الله عليه وسلم أكملَ الخلق ذكراً لله عز وجل، بل كان كلامُهُ كلُّه في ذكرِ الله وما والاه، وكان أمرُهُ ونهيُهُ وتشريعُه للأمة: ذكراً منه لله تعالى، وإخبارُه عن أسماء الربِّ وصفاتِهِ وأحكامِهِ وأفعالِهِ ووَعْدِهِ ووعيدِهِ: ذكراً منه لله تعالى، وسؤالُهُ ودعاؤه إياه ورغبتُه ورهبتُه: ذكراً منه لله تعالى، وكان سكوتُه وصَمْتُهُ: ذكراً منه لله تعالى بقَلْبِه.

فكان ذاكراً لله تعالى في كل أحيانه، وعلى جميع أحواله، فكان ذِكرُهُ لله تعالى يجري مع أنفاسه: قائماً وقاعداً، وعلى جنبه، وفي مَشْيِه وركوبه، ومسيرِهِ ونزولِهِ، وظَعْنِهِ وإقامته». انتهى كلامُ الإمام ابن القيم رحمه الله تعالى.

فساحةُ ذكرِ الله تعالى واسعةٌ تَشمَلُ جوانبَ الحياة كلِّها، ويتغلغلُ الذكرُ في أعمالِ الإنسان ونُطقِهِ وسُكوتِهِ، وسِرِّهِ وجهرِهِ، على انفراد أو بجماعة، وكلُّ ذلك مشروع بشروطه وآدابه.

---

(١) الوَرِقُ: الفضّة.

(٢) رواه الإمام أحمد في «المسند» ٥: ١٩٥ و٦: ٤٤٧، بإسنادٍ حسن، والترمذي في «جامعه» ٥: ٤٥٩ في كتاب الدعاء، وابن ماجه في «سننه» ٢: ٢٤٥ في كتاب الأدب (باب فضل الذكر)، والحاكم في «المستدرك» ١: ٤٩٦، وقال: «حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه»، وأقرّه الذهبي فقال فيه: «صحيح».

(٣) ٢: ٣٧.

وقد ذهب بعض العلماء إلى منع الجهر بالذكر منفرداً أو بجماعة. ولكن الحقَّ جوازه ومشروعيته بشروطه، كما حقَّقه الإمام اللكنوي في هذه الرسالة، والإمامُ السيوطي قبلَه رحمهما اللَّه تعالى وجزاهما عن العلم والإسلام والمسلمين خيراً.

وما كتباه وحقَّقاه إنما هو في الذكر المشروع، أما الذكرُ الذي يقومُ به بعض الناس بحركاتٍ موزونةٍ مرتَّبة، وترنيماتٍ متصنَّعةٍ مُطرِبة، وقَفْزٍ ووَثْب، ونَطٍّ وجَذْب، وانحناءٍ للأمام ورفع، والتفاتٍ عنيفٍ ودَفْع، فهو الذكرُ الممنوع، والفِطَرُ السليمةُ تنبو عنه، والقلبُ الخاشعُ يتبرأُ منه، لو خَشَع قلبُ هذا لَخَشَعَتْ جوارحُه، كما قاله التابعي الجليلُ سعيدُ بنُ المسيَّب رضي اللَّه عنه.

وهذا الذكرُ ما عُهِدَ فِعلُه من السلف في القرونِ المشهود لها بالخير، وما يُقالُ في تعليل الحركاتِ والوَثَبات: إنَّها لمنعِ الخاطر أن يشتغل بغير اللَّه تعالى، فهو مردودٌ بما عُرِفَ من حال السلف، فقد كانوا أحرَصَ منا على حِفظِ خواطِرِهم وقلوبهم، وجَعْلِها مع اللَّه تعالى، ولم يكونوا يفعلونه، بل ذُكِرَ لهم فأنكروه أشدَّ الإنكار، وهم الأئمةَ المقتَدَى بهم، والمرجوعُ إليهم، وإليكَ جملةً يسيرةً من كلامهم في ذلك:

روى الإمام البخاري رحمه اللَّه تعالى في «صحيحه» ٢:٤٤٥، في كتاب العيدين، في (باب سُنَّةِ العيدين لأهل الإسلام): «عن عائشة رضي اللَّه عنها قالت: دَخل أبو بكر وعندي جاريتان من جواري الأنصار، تُغَنِّيانِ مما تقاوَلَتْ الأنصارُ يومَ بُعاثَ، قالت: وليسَتا بِمُغَنِّيتينِ...».

قال الحافظ ابن حجر رحمه اللَّه تعالى، في «فتح الباري» ٢:٤٤٢ «واستدَلَّ جماعةٌ من الصوفية بحديث: (وعندي جاريتان تغنيان) على إباحة الغِناء وسماعِه، بآلةٍ وبغيرِ آلة.

ويكفي في رَدِّ ذلك تصريحُ عائشةَ في الحديث بقولها: (وليسَتا بمغنيتين)، فنفت عنهما من طريق المعنى ما أثبَتَتْهُ لهما باللفظ، لأن الغناء يُطلَقُ على رفع الصوت، وعلى الترنُّم الذي تُسمِّيه العربُ: النَّصْب، بفتح النون وسكون المهملة،

وعلى الحُداء. ولا يُسمَّى فاعلُه مُغنِّيا، وإنما يُسمَّى بالمُغنِّي من يُنشِدُ بتمطيط وتكسير، وتهييج وتشويقٍ بما فيه تعريضٌ بالفواحش أو تصريح.

قال القرطبي ـ هو المحدِّث أبو العباس أحمد بن عمر، شارح صحيح مسلم، وشيخ القرطبي المفسِّر ـ قولُها: ليستا بِمُغنِّيَتَيْنِ، أي ليسَتَا ممن يَعرِفُ الغناءَ كما يَعرفُه المغنيات المعروفاتُ بذلك. وهذا من عائشة رضي الله عنها تحرُّزٌ عن الغِناء المعتاد عند المشتهرين به، وهو الذي يُحرِّكُ الساكن، ويَبعثُ الكامن. وهذا النوعُ إذا كان في شعرٍ فيه وَصْفُ محاسن النساء والخمر وغيرهما من الأمور المحرَّمة: لا يُختلَفُ في تحريمه.

قال: وأما ما ابتدعَتْهُ الصوفية في ذلك، فمن قبيل ما لا يُختلَفُ في تحريمه، لكن النفوس الشهوانية غلبَتْ على كثير ممن يُنسَبُ إلى الخير، حتى لقد ظهرت من كثير منهم فَعَلاتُ المجانين والصبيان، حتى رقصوا بحركات متطابقة، وتقطيعاتٍ متلاحقة، وانتهى التواقحُ بقوم منهم إلى أن جعلوها من باب القُرَب وصالح الأعمال، وأن ذلك يُثمِرُ سَنِيَّ الأحوال، وهذا على التحقيق: من آثارِ الزندقة، وقولِ أهلِ المَخْرَقَة، والله المستعان. انتهى».

قال الحافظ ابن حجر عَقِبَهُ: «وينبغي أن يُعكَس مُرادُهم، ويُقرأ: (يُثمِرُ سَيِّـىءَ الأحوال، عِوَضَ سَنِيِّ الأحوال).» انتهى.

وفي هؤلاء المفتونين قال القائل مُنْكِراً عليهم أقوالَهم وأفعالَهم:

أقـال الـلّهُ صَفِّـقْ لي وغَـنِّي ... وقُـلْ نُكْراً وسَمِّ الـرَّقْصَ ذِكْرَا

وقال الإمام القاضي عياض رحمه الله تعالى، في ترجمة الإمام مالك رضي الله عنه، في «ترتيب المدارك» ٢: ٥٤ «قال التِّنِّيسي: كنا عند مالكٍ وأصحابُهُ حولَه، فقال رجل من أهل نَصِيبِين: عندنا قومٌ يُقالُ لهم: الصوفية، يأكلون كثيراً، ثم يأخذون في القصائد، ثم يقومون فيرقصون؟ فقال مالك: أصِبيانٌ هم؟ قال: لا، قال: أمجانينُ هم؟ قال: لا، هم قومٌ مشايخ، وغيرُ ذلك، عقلاءُ، فقال مالك: ما سَمِعتُ أنَّ أحداً من أهلِ الإسلامِ يفعل هذا!

فقال له الرجل: بل يأكلون، ثم يقومون ويرقصون دَوَائِبَ، ويَلطِمُ بعضُهم رأسَه، وبعضُهم وجهَه، فضَحِكَ مالك ثم قام فدخل منزله، فقال أصحابُ مالك للرجل: لقد كنتَ يا هذا مَشْؤُوماً على صاحبنا، لقد جالسناه نيِّفاً وثلاثين سنة، ما رأيناه ضَحِكَ إلا في هذا اليوم!». انتهى.

وقال القرطبي المفسِّرُ الصُّوفيُّ في تفسيره «الجامع لأحكام القرآن» ٧: ٣٦٥، عند تفسيرِهِ لقوله تعالى في أول سورة الأنفال: ﴿إنما المؤمنون الذين إذا ذُكِرَ اللّهُ وَجِلَتْ قلوبُهم، وإذا تُلِيَتْ عليهم آياتُه زادَتْهُمْ إيماناً، وعلى ربِّهم يَتوكَّلُون﴾، قال رحمه الله تعالى: «وَصَفَ اللّه تعالى المؤمنين في هذه الآية بالخوف والوَجَل عند ذكره، وذلك لقوة إيمانهم، ومُراعاتِهم لربهم، وكأنهم بين يديه.

ونظيرُ هذه الآية: ﴿وبَشِّرِ المُخْبِتِين * الذين إذا ذُكِرَ اللّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهم﴾[١]. وقال: ﴿وتَطْمَئِنُّ قلوبُهم بذكر اللّه﴾[٢]. فهذا يَرجِعُ إلى كمال المعرفة، وثقةِ القلب. والوجَلُ: الفَزَعُ من عذاب اللّه، فلا تَناقُضَ.

وقد جَمَعَ اللّه بين المعنيين في قوله: ﴿اللّهُ نَزَّلَ أحسَنَ الحديثِ كتاباً مُتَشابِهاً مَثانيَ تَقْشَعِرُّ منه جُلُودُ الذين يَخشَوْن ربَّهم، ثم تَلِينُ جلودُهم وقلوبُهم إلى ذكرِ اللّه﴾[٣]. أي تَسكُنُ نفوسُهم من حيث اليقينُ إلى اللّه، وإن كانوا يخافون اللّه.

فهذه حالةُ العارفين باللّه، الخائفين من سطوته وعقوبته، لا كما يفعله جُهَّالُ العَوامِّ والمبتدِعةُ الطَّغَام، من الزَّعِيق والزئير ــ أي الصياح الشديد ــ، ومن النُّهَاقِ الذي يُشبِهُ نُهاقَ الحمير، فيقال لمن تعاطَى ذلك، وزَعَم أنَّ ذلك وَجْدٌ وخُشوع: لم تَبلُغ أن تساوي حالَ الرسول ولا حالَ أصحابه في المعرفةِ باللّه، والخوفِ منه، والتعظيم لجلاله.

ومع ذلك فكانت حالُهم عند المواعظ: الفهمَ عن اللّه، والبكاءَ خوفاً من

---

(١) من سورة الحج، الآية ٣٤ و ٣٥.

(٢) من سورة الرعد، الآية ٢٨.

(٣) من سورة الزُّمَر، الآية ٢٣.

اللّه، ولذلك وَصَف اللّه أحوالَ أهل المعرفة عند سماع ذكره وتلاوةِ كتابه فقال: ﴿وإذا سَمِعُوا ما أُنزِلَ إلى الرسول تَرَى أعينَهم تَفِيضُ من الدَّمْع مما عَرَفوا من الحقِّ، يقولون: ربَّنا آمَنَّا فاكتبنا مع الشاهدين﴾[١].

فهذا وصفُ حالهم، وحكايةُ مَقالِهم. ومن لم يكن كذلك فليس على هَدْيهم، ولا على طريقتِهم، فمن كان مستناً فليستنَّ بهم، ومن تعاطَى أحوالَ المجانين والجنونِ فهو من أخسِّهم حالاً، والجنونُ فنون.

وروى مسلم عن أنس بن مالك رضي اللّه عنه[٢]، أنَّ الناس سألوا النبي صلى اللّه عليه وسلم حتى أحفَوْه ـ أي أكثروا عليه ـ في المسألة، فخرج ذات يوم، فصَعِدَ المنبر فقال: سَلُوني، لا تسألوني عن شيء إلا بيَّنتُه لكم ما دُمتُ في مقامي هذا، فلما سَمِعَ ذلك القومُ أرَمُّوا ـ أي أمسكوا وسكتوا ـ، ورَهِبُوا أن يكون بين يَدَيْ أمْرٍ قد حَضَر، قال أنس: فجعلتُ ألتفِتُ يميناً وشِمالاً، فإذا كلُّ إنسان لافٌّ رأسَه في ثوبه يبكي! وذَكَر الحديث.

وروى الترمذي وصحَّحه[٣] عن العِرباض بن سارية، قال: وَعَظَنا رسول اللّه صلى اللّه عليه وسلم موعظةً بليغة، ذَرَفَتْ منها العيون، ووَجِلَتْ منها القلوب. الحديث. ولم يقل: زَعَقْنا، ولا رَقَصْنا، ولا زَفَنّا ـ أي ضَرَبْنا الأرضَ بأرجلنا كما يفعل الراقص ـ، ولا قُمنا». انتهى.

ونَقَل العلامة المحقق الشيخ أحمد الطحطاوي الفقيه الحنفي، في حاشيته على «مراقي الفلاح» للشُرُنْبلالي، في آخر (فصل ما يفعله المقتدي بعدَ فراغ إمامه)، ما يلي: «وأما الرَّقْصُ والتصفيقُ والصَّريخُ وضَرْبُ الأوتار بالصَّنج والبُوْق،

---

(١) من سورة المائدة، الآية ٨٣.

(٢) في كتاب الفضائل من «صحيحه» ١٥: ١١٥ في (باب توقيره ﷺ)، ورواه البخاري في «صحيحه» أيضاً ١٣: ٤٣ في كتاب الفتن (باب التعوذ من الفتن).

(٣) في «جامعه» ٥: ٤٤ في كتاب العلم (باب ما جاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدَع). وقال: حديث حسن صحيح.

الذي يَفعَلُهُ بعضُ من يَدَّعِي التصوف، فإنه حَرَامٌ بالإجماع، لأنَّها زِيُّ الكُفَّار».
يعني من شاراتِهم وعلاماتِهم وأفعالِهم.

قال عبدالفتاح: فلَيْتَ أولئك الذاكرين ـ وهم يقولون: إنَّ هذه الحركات الموزونة.. مُباحَةٌ ولا تَخرجُ عن المباح ـ فلَيْتَهم إن لم يَخضعوا لأقوالِ الأئمةِ الناهيةِ المحرِّمةِ لتلك الحركات، اعتبروا أقوالَهم في النهي عنها والتحريم: تقومُ بها شبهة في حِلِّ فعلها والتلبُّس بها، فتركوها تنزُّهاً وابتعاداً عما قال العلماء فيه: حرام، فالصُّوفِيُّ كما عرَّفوه: من يَتَوقَّى الشُّبُهات، ويَترُكُ بعضَ المباحات، خشيةَ الوقوع في المكروهات، فضلاً عن المحرَّمات، واللّٰه الهادي لمن استهداه، فاهدنا اللّهم لما تحبه وترضاه.

وختاماً: أسأل اللّٰه تعالى أن ينفع بهذا الكتاب، ويُكثِرَ في الأمة من الذاكرين اللّٰه كثيراً والذاكرات، وأن يَغفِرَ لمؤلِّفه ويَرحمَه ويرضى عنه، وأن يغفر لنا ولوالدينا ولمشايخنا وللمسلمين والمسلمات، وهو الغفور الرحيم، وصلى اللّٰه على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم، والحمد للّٰه رب العالمين[١].

وكتبه

في الرياض ١ من رجب سنة ١٤٠٧ — عبدالفتاح أبو غُدّة

---

(١) تنبيهٌ وبيان: كنتُ ذكرتُ هذا الكتابَ «سِباحة الفِكر في الجهر بالذكر» في تعليقي على كتاب «رسالة المسترشدين» للمحاسبي ص ٦٥، وبيَّنتُ بالإجمال موضوعَه ومباحثَهُ في شأنِ الجهر بالذكر، ثم قلتُ: «ولبعض علماء نجد ـ ابن سمحان؟ ـ رسالة مطبوعة في جوازه أيضاً». انتهى. ولم أكن وقفتُ على الرسالة هذه لابن سحمان، وإنما أخبرني بها بعضُ علماء نجد، فسجلتُ ذلك استناداً لقوله! وأشرتُ إلى عدم وقوفي عليها بوضع إشارة الاستفهام، ثم وقفتُ عليها بعدَ ذلك فرأيتُها لا صِلَةَ لها بهذا الموضوع، فاقتضى مني التنبيه والبيان.

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

حَمْداً لمن أعدَّ للذاكرين الفضلَ العظيم، وشكراً لمن وَعَدَ للقانتين الوعدَ الجسيم، أشهدُ أنه لا إله إلا هو التواب الرحيم، وأشهدُ أن محمداً عبدُه ورسولُه صاحبُ الخُلُق العظيم، صلَّى اللَّه عليه وعلى آله وصحبه صلاةً تُدخلنا في دار النعيم.

وبعدُ فيقول المشتاقُ إلى رحمة ربه القويّ، أبو الحسنات محمد عبدالحي اللَّكْنَوِيّ، تجاوزَ اللَّه عن ذنبه الجَلِيّ والخَفِي: إني قد سُئلتُ عن حكم الجهر بالذكر، هل هو جائز أم لا، فأجبتُ بأن أكثر أصحابنا وإن صرَّحوا بكراهته وحُرمتِه، لكنَّ محققِّيهم على جوازِهِ ما لم يُجاوز الحدّ، لأحاديثَ وردَتْ بذلك.

ثم أردتُ أن أكتب في هذا الباب رسالةً مسماة بـ (سِبَاحَة الفِكر في الجَهْر بالذِكر)، مرتبةً على بابين:

الباب الأول في حكم الجهر بالذكر، مُورِداً فيه أقوالَ أصحابنا الحنفية، مُحِقّاً للحقِّ بالأحاديث المرويَّة.

والثاني في تحقيق المواضع التي صَرَّحوا بحكم الجهر فيها، سائلاً من اللَّه تعالى أن يجعلها جامعةً لما يتعلق بالباب، ويُلهمَني الصدقَ والصواب.

ولنقدم ها هنا مقدمةً تشتمل على ذكر حد الجهر والسر وما يتعلق به، فنقول: اختلفوا في حد الجهر والسر على ثلاثة أقوال، والمذكورُ في عامة الكتب منها اثنان:

الأول: ما ذَهَب إليه الكَرْخي، من أن أدنى الجَهْر أن يُسمِعَ نفسَه، وأدنى السِّرّ تصحيحُ الحروف، وهو قولُ أبي بكر الأعمش البَلْخي كما في «المحيط»، ومَرْوِيٌّ عن محمد والقُدُوريِّ كما في «المجتبى»، وعن أبي الحسن الثَّوْرِيِّ[١] كما في «جامع الرموز» عن المسعودي، وعن أبي نصر بن سلام كما في «جامع الرموز» عن العِمَادي.

وفي «الجوهرة النيِّرة» في شرح قول القُدُوْرِي: وإن كان منفرداً فهو مخيَّر، إن شاء جَهَر وأسمَع نفسَه الخ. قولُه: أسمَع نفسَه ظاهرُه أنَّ حَدَّ الجهر أن يُسمِعَ نفسَه، وحَدَّ المُخافَتَةِ تصحيحُ الحروف، وهذا قول أبي الحسن الكَرْخي، فإنه قال: أدنى الجهر أن يُسمِعَ نفسَه، وأقصاه أن يُسمِعَ غيرَه، ووَجْهُهُ أن القراءة فِعلُ اللسان دون الصِّماخ. انتهى.

وفي «البدائع» قولُ الكرخي أصحُّ وأقيس، وفي كتاب الصلاة لمحمد رحمه الله تعالى إشارةٌ إليه، فإنه قال: إن شاء قرأ في نفسه، وإن شاء جَهَر وأسمَع نفسَه، فإنه يدلُّ على اختيار قولِ الكرخي. انتهى.

---

(١) كذا هو في الأصل (أبي الحسن الثوري)، وهو هكذا أيضاً في «جامع الرموز» للقُهُسْتَاني، ص ٧٤. ولم أهتد إلى ترجمته، مع المراجعة لكتب الأنساب وكتب تراجم الحنفية، فالله أعلم.

وفي «الهداية» قال الكرخي: أدنى الجهر أن يُسمِعَ نفسَه، وأدنى المخافتة تصحيحُ الحروف، لأن القراءة فعلُ اللسان دون الصِّماخ. انتهى.

قال في «غاية البيان»: قيل: الكتابةُ لا تُسمَّى قراءةً وإن وُجِدَ فيها تصحيحُ الحروف، لأن الصوت لم يوجد.

أقول: هذا لا يَرِدُ على الكرخيِّ أصلاً، لأنه لم يَجعل مطلقَ تصحيح الحروف قراءةً، بل تصحيحُ الحروف باللسانِ، والكتابةُ يَحصُلُ بها تصحيحُ الحروفِ لا باللسانِ بل بالقَلَم.

وقيل: الكلامُ فِعلُ اللسان مع الصوت، وإقامةُ الحروف ليست بصوت.

أقول: التقييدُ بالصوت اصطلاحٌ من هذا القائل، فلا يكون حجةً على غيره، فلا تَسْمَعْه، على أنَّا نقول: الكلامُ مَعْنًى: يُنافي الخَرَسَ والسكوتَ، وبالتصحيح يَحصُلُ هذا المعنى، فلا يُحتاج إلى الصوت. انتهى.

وفي «فتح القدير» قولُه: وفي لفظ الكتاب إشارةٌ إليه، أي إلى قول الكرخي، وهذا بناءً على أن المراد: وأسمَعَ نفسَه لا غيرَه اعتباراً بمفهوم اللقب، وإلا لو كان المرادُ مجرداً به لم يَحسُن.

واعلم أن القراءة وإن كانت فعلَ اللسان، لكن فعلُه الذي هو كلام، والكلامُ بالحروف، والحرفُ كيفيةٌ تَعرِضُ للصوت لا للنَّفَس، فمجرَّدُ تصحيحها بلا صوت إيماءٌ إلى الحروف بعضلات المخارج، لا حروف، فلا كلام. انتهى.

القول الثاني: ما ذهب إليه الفقيه أبو جعفر الهِنْدُوَاني (١) والإمام أبو بكر محمد بن الفَضْل، من أنه لا بُدَّ في الجهر من إسماع غيره، فأدنى الجهر عنده إسماعُ غيره، ولو كان واحداً، وأدنى السر إسماعُ نفسه لا مجرَّدُ تصحيح الحروف.

وهو الصحيح، كما في «الوقاية» و«النُّقَاية» و«ملتَقَى الأَبْحُر»، وهو مختار شيخ الإسلام وقاضي خان وصاحب «المحيط» والحَلْواني كما في «مِعراج الدِّرَاية»، واختاره شُرَّاحُ «الوِقاية» و«النُّقاية» و«ملتقى الأبحر» وشراح «الهداية» وعامَّةُ أصحابِ الفتوى، وفي «المُضْمَرات» هو المختار.

وفي «الفتاوى الخيرية» بعدَ سَرْدِ العبارات الواقعة في المذهبين: أقولُ: لما كان أكثرُ المشايخ على اختيار قول الهِنْدُوَاني عَوَّل عليه في متن «تنوير الأبصار»، فظاهرُ كلام القُدُوْرِي اختيارُ قول الكُرْخي، فقد اختَلَف التصحيح، لكن ما قال الهِنْدُوَاني أصَحُّ وأرجحُ لاعتمادِ أكثر علمائِنا عليه. انتهى.

واختلفوا في أن المراد بالغير، في قول الهِنْدُوَاني: أدنى الجهر إسماعُ غيرِه، ماذا؟ فالعامَّةُ على ما ذكرنا من أن المراد به غيرُه وإن كان واحداً، فلو سَمِعَ اثنانِ كان أعلى من الجهر، لكن في «صلاة

---

(١) الهِنْدُوَاني: بكسر الهاء وسكون النون وضم الدال المهملة وفتح الواو، بعد الألِفِ نون، نسبةٌ إلى محلة ببَلْخ، اسمه أبو جعفر محمد بن عبدالله بن عمر، مات في بخارى سنة ٣٦٢، عن ٦٢ سنة رحمه الله تعالى. ترجمته وضبط نِسبتِهِ في «الجواهر المُضِيَّة في طبقات الحنفية» للحافظ القرشي ٢: ٦٨ و ٣٥٤.

المسعودي»: أنَّ جَهْرَ الإمام إسماعُ الصفِّ الأوَّل، وفي «الخلاصة» و«المجتبى» أنه سماعُ الكل.

قال في «جامع الرموز»: كلتا الروايتين لا يخلو عن شيء، لأنه يَلزمُ منه أنه لو كان القوم كثيراً بحيث لم يَسمَع الكلُّ يكون مُخافَتَةً. انتهى.

وفي «النهر الفائق»: الجهرُ عند الهِنْدُوَاني إسماعُ غيرِه، وما في «الخلاصة» ـ لو قرأ في المُخافتة بحيث يَسمعُ رجلٌ أو رجلانِ، لا يكون جهراً، والجهرُ أن يُسمِعَ الكلَّ ـ: مشكِلٌ: انتهى.

وفي «الدر المختار»: أدنى المخافَتَةِ إسماعُ نفسِه ومَنْ بِقُربِهِ، فلو سَمِعَ رجل أو رجلان، فليس بجهرٍ. انتهى.

قال ابن عابدين في «ردّ المُحْتار»: قولُه: ومن بِقُرْبِه تصريحٌ باللازم، وفي القُهُسْتاني وغيرِه: أو مَنْ بِقُرْبِه، بأو، وهو أوضح، وينبني على ذلك أنَّ أدنى الجهر إسماعُ غيره أي ممن لم يكن بقُرْبه، ولذا قال في «الخلاصة» و«الخانِيَّة» عن «الجامع الصغير»: «إنَّ الإمامَ إذا قرأ في صلاةِ المُخافتةِ بحيث يَسمَعُ رجل أو رجلان لا يكون جهراً، والجهرُ أن يُسمِعَ الكلَّ أي كلَّ الصّفِّ الأول، لا كُلَّ المصلّين بدليل ما في «القُهُسْتاني» عن «المسعودية»: أنَّ جَهْرَ الإمام إسماعُ الصفِّ الأول.

وبه عُلِمَ أنْ لا إشكالَ في كلام «الخلاصة»، وأنه لا يُنافي كلامَ الهِنْدُواني، بل هو مُفرَّع عليه، فقد عَلِمتَ أنَّ أدنى المخافتة إسماعُ نفسه أو من بقُربِهِ من رجل أو رجلين مثلاً، وأدنى الجهر إسماعُ غيره ممن ليس بقُربه كأهلِ الصفِّ الأول، وأعلاه لا حَدَّ له. انتهى كلامه.

وفي «البحر الرائق»: أدنى الجهر عند الهِنْدُواني أن يكون مسموعاً
له، زاد في «المُجْتَبى» في النقل عنه[1]: أنه لا يُجزيه ما لم تَسْمَعْ أُذُناه
ومَنْ بقُرْبِهِ، ونَقَل في «الذخيرة» عن الحَلْوَاني أنَّ الأصح هو هذا،
ولا ينبغي أن يُجعَلَ هذا قولاً رابعاً، بل هو قولُ الهِنْدُواني الأوَّلُ، وفي
العادةِ أنَّ ما كان مسموعاً له، يكون مسموعاً لمن بقُرْبِهِ أيضاً. انتهى.

وفي «الذخيرة»: ذَكَرَ القاضي علاءالدين في شرح «مُخْتَلِفاتِه» أنَّ
الصحيح عندي أنَّ في بعض التصرفات يُكتفَى بسماعِه، وفي بعضها
يُشتَرَطُ سَمَاعُ غيرِه، مثلاً في البيع: لو أدْنَى المشترِي أُذُنَه إلى فم البائع
فسَمِعَ يكفي، ولو سَمِعَ البائعُ نفسَه لا يكفي؛ وفيما إذا حَلَفَ لا يُكلِّمُ
فلاناً، فناداه من بعيد بحيث لا يَسمعُ لا يَحْنَث، نَصَّ عليه في كتاب
الأيمان. انتهى.

القول الثالث: ما ذهب إليه بِشْرٌ المَرِيسيّ[2]، من أنه لا بُدَّ في
وجودِ القراءة من خروجِ الصوت، وإن لم يَصِلْ إلى أُذُنِهِ، لكن بشرط
كونِهِ مسموعاً في الجملة.

قال في «فتح القدير»: ولعله المرادُ بقول الهِنْدُواني، بناءً على أن
الظاهر سماعُهُ بعد وجود الصوت إذا لم يكن مانع. انتهى.

---

(١) أي عن الهندواني.

(٢) هو بِشر بن غِياث المَرِيسيّ ـ نسبة إلى دَرْب المَرِيس في بغداد ـ
معتزلي عارف بالفلسفة، يُرمَى بالزندقة، وهو رأس الطائفة المَرِيسيَّة، و
برأي الجهمية، أخذ الفقه عن القاضي أبي يوسف ولازمه، وكان أبو يوسف
يذمه ويُعرض عنه، عاش نحو ٧٠ سنة، وتوفي سنة ٢١٨

فاختار أنَّ قولَ بِشْرٍ وقولَ الهِنْدُواني متحدان، وهو خلافُ الظاهر، فإن الظاهر من عباراتهم أنَّ في المسألة ثلاثة أقوال:

فقال الكرخي: القراءةُ تصحيحُ الحروف وإن لم يكن الصوتُ بحيث يُسمَع.

وقال بِشْرٌ: لا بُدَّ أن يكون بحيث يُسمَع.

وقال الهِنْدُواني: لا بُدَّ أن يكون مسموعاً[١]، كذا في «حلية المحلي»[٢] و«البحر» وغيرهما.

---

(١) أي مسموعاً له ولغيره.

(٢) هكذا وقع للمؤلف الخطأ في تسمية هذا الكتاب هنا وفي كتابه «الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة»، في مشكلات من علوم الحديث، ص ١٩٧، وهو تحريف عن «حَلْبَة المُجَلِّي شرح مُنْيَة المصلي» لابن أمير الحاج، كما أوضحته مطولاً في تعليقي على «الأجوبة الفاضلة»، ص ١٩٧ ــ ٢٠١.

الباب الأول

في حكم الجهر بالذكر

اعلم أنهم اختلفوا في ذلك، فجوَّزه بعضُهم، وكَرَّهه بعضُهم، وحرَّمه بعضُهم، وجعَله بعضُهم بدعةً إلا في مواضع وَرَد الشرع بالجهر فيها، على ما سيأتي ذكرها.

فقال في «الهداية» في فصل تكبير التشريق: يَبدأ بتكبيرُ التشريق بعد صلاةِ الفجر من عَرَفة، ويَختِمُ عَقِيبَ صلاةِ العصر من يوم النحر عند أبي حنيفة، وقالا[١]: يَختِمُ عقيبَ العصرِ من أيام التشريق، والمسألة مختلِفةٌ بين الصحابة، فأخَذَا[١] بقول علي رضي الله عنه أخذاً بالأكثر للاحتياط، وأخَذَ[٢] بقولِ ابن مسعود أخذاً بالأقل، لأنَّ الجهرَ بالتكبير بدعة. انتهى.

وفي «فتح القدير» قولُه: لا يُكبِّر في الطريق في عيد الفِطر، الخلافُ في الجهر بالتكبير في الفِطر لا في أصلِه، لأنه داخلٌ في عموم ذكرِ الله، فعندهما يَجهَرُ به كالأضحى، وعنده لا.

وفي «الخلاصة» ما يفيد أن الخلاف في أصل التكبير، وليس

---

(١) أي الصاحبان: أبو يوسف ومحمد.

(٢) أي أبو حنيفة.

بشيء، إذ لا يُمنَعُ مِن ذكرِ اللَّه في شيء من الأوقات، بل من إيقاعه على وجه البدعة، فقال أبو حنيفة: رَفْعُ الصوتِ بالذكر بدعةٌ يُخالِفُ الأمرَ في قوله تعالى: ﴿واذكُرْ ربَّكَ في نَفْسِك تَضرُّعاً وخِيْفَةً ودُونَ الجَهْرِ من القَوْلِ﴾ الآية[١]. فيُقتَصَرُ فيه على موردِ الشرع، وقد وَرَدَ به في الأضحى وهو قوله تعالى: ﴿واذكُروا اللَّه في أيامٍ معدوداتٍ﴾[٢]، جاء في التفسير أن المراد به هذا التكبيرُ في هذه الأيام، والأَولى الاكتفاءُ فيه[٣].

فإن قيل: فقد قال اللَّه تعالى: ﴿وَلِتُكْمِلُوا العِدَّةَ وِلتُكَبِّروا اللَّه على ما هَدَاكم﴾[٤]، وروى الدارقطني[٥] عن سالم، أن عبداللَّه بن عمر أخبره، أن رسول اللَّه صَلّى اللَّه عليه وعلى آله وسلم «كان يُكبِّرُ في الفِطر من حينِ يَخرجُ من بيتِهِ حتى يأتيَ المصلَّى».

فالجواب: أنَّ صلاة العيد فيها التكبير، والمذكورُ في الآية بتقدير كونِهِ أمراً أعمُّ منه ومما في الطريق، والحديثُ المذكورُ ضعيفٌ بموسى بن محمد بن عطاء المَقْدِسِي، ثم ليس فيه أنه كان يَجهرُ به، وهو محلُّ النزاع، وكذا رواه الحاكم مرفوعاً[٦]، ولم يَذكر الجهر.

نَعَمْ روى الدارقطني[٧] عن نافع موقوفاً على ابن عمر، أنه كان

---

(١) من سورة الأعراف، الآية ٢٠٥.

(٢) من سورة البقرة، الآية ٢٠٣.

(٣) في «فتح القدير» ١ : ٤٢٤ «والأولى الاكتفاءُ فيه بالإجماع عليه، لما سنذكره في قوله تعالى: ﴿ولتكبِّروا اللَّه على ما هداكم﴾».

(٤) من سورة البقرة، الآية ١٨٥.

(٥) في «سننه» ٢ : ٤٤ في كتاب العيدين.

(٦) في «المستدرك» ١ : ٢٩٨.

(٧) ٢ : ٤٥.

إذا غدا يومَ الفِطرِ والأَضْحَى يَجهَرُ بالتكبير. قال البيهقي: الصحيحُ وقفُه على ابن عمر، وقولُ الصحابـي لا يُعارَضُ به عمومُ الآيةِ القطعيةِ الدلالة، أعني قولَه تعالى: ﴿وَٱذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ﴾ الآية[١]، وقد قال عليه الصلاة والسلام: «خيرُ الذِّكرِ الخَفِيّ»[٢]، وهو مُعارَضٌ بقولِ صحابـي آخَر، وهو ما رُوِي عن ابن عباس أنه سَمِعَ الناسَ يكبِّرون، فقال لـرجلٍ: أَكَبَّرَ الإمامُ؟ قيل: لا، فقال: أَجُنَّ الناسُ؟! أدركنا مِثلَ هذا اليوم مع رسول اللَّه فما كان أحدٌ يُكَبِّرُ قبلَ الإمام. انتهى.

وفي «غاية البيان» قولُه: ولا يكبِّرُ. اهـ. المرادُ منه التكبيرُ بصِفَةِ الجهر، لأن التكبيرَ خيرُ موضوع، لا خلاف في جوازه بصِفَة الإخفاء، على ما حكاه أبو بكر الرازي، ووجهُهُ أن الأصل في الذكر الإخفاء، لقوله تعالى: ﴿ٱدْعُوا رَبَّكُم تَضَرُّعاً وخُفْيَةً﴾[٣]، وقولِهِ عليه الصلاة والسلام: «خيرُ الذكر الخفي»، والشرعُ وَرَد بالجهر في الأضحى فلا يُقاسُ عليه الفطر، لأن الجهر على خلاف الأصل. انتهى ملخصاً.

وفي «البِنَاية شرح الهداية» للعيني: قال أبو بكر الرازي: قال مشايخنا: التكبيرُ جهراً في غير أيام التشريق والأضحى لا يُسَنُّ إلا بإزاءِ

---

(١) من سورة الأعراف، الآية ٢٠٥.

(٢) ذكره الحافظ الهيثمي في «مجمع الزوائد» ١٠: ٨١، وقال: «رواه أحمد ١: ١٧٢، ١٨٠، ١٨٧. وأبو يعلى. وفيه محمدُ بنُ عبدالرحمن بن لَبِيْبه. وقد وثَّقه ابنُ حبان، وقال: رَوى عن سعد بن أبي وقاص. قلتُ: وضعفه ابنُ معين، وبقيَّةُ رجالِهِ رجال الصحيح». انتهى. وسيأتي تخريجُ الحديث في كلام المؤلف أيضاً في ص ٤٣.

(٣) من سورة الأعراف، الآية ٥٥.

العدُوّ واللُّصُوص، وقيل: وكذا في الحريقِ والمَخَاوِفِ كلِّها. انتهى.

وفي «الدر المختار» في باب ما يُفسِدُ الصلاة وما يُكرَه، عند ذكر أحكام المسجد: ويَحرُمُ فيه السؤالُ، ويُكرَهُ الإعطاءُ مطلقاً، وقيل: إن تَخَطَّى، وإنشادُ ضَالَّةٍ أو شِعْرٍ إلا ما فيه ذِكر، ورفعُ صوتٍ بذكر إلا للمتفقه. انتهى، وهو مأخوذ من «الأشباه والنظائر».

وفي «تعاليق الأنوار حاشية الدر المختار»[١] قوله: ورفعُ صوت بذكر الله لما رُوي عن ابن مسعود أنه رأى قوماً يُهلِّلُون برفع الصوت في المسجد، فقال: ما أَراكم إلا مُبتدِعين، وأَمَر بإخراجهم.

لكن قال العلاّمة الحِفْنِي في رسالة «فضل التسبيح والتهليل» ما نُقِلَ عن ابن مسعود غيرُ ثابت، بدليل ما في كتاب «الزهد» بالسند إلى أبي وائل، أنه قال: هؤلاء الذين يزعمون أنَّ عبدالله بن مسعود كان يَنهى عن الذكر، ما جالستُه مجلساً إلا ذَكَر الله أي جَهَر.

ومما يَدلُّ على طلب رفع الصوت بالذكر: خبرُ البيهقي أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مرَّ به رجل في المسجد يرفع صوتَه بالذكر، فقيل له: يا رسول الله، عَسَى أن يكون هذا مُرائِياً، فقال: لا، ولكنه أوَّاهٌ[٢]. أي كثيرُ الوَجَع من حرارة العِشق لله تعالى، فهذا يُفيد جوازَ رفع الصوت بالذكر، فليتأمل. انتهى.

---

(١) في «إيضاح المكنون» ١: ٢٩٤ «تعاليق الأنوار على الدر المختار، شرح تنوير الأبصار: في الفروع، لعبدالمولى بن عبدالله الدمياطي الحنفي تلميذ الطحطاوي، فرغ منه سنة ١٢٣٨، وتوفي سنة...».

(٢) في «مجمع الزوائد» للحافظ الهيثمي: «عن عقبة بن عامر أن النبي ﷺ قال لرجل يقال له: ذو البِجَادَيْنِ: إنه أوَّاه. وذلك أنه كان كثير الذكر لله عز وجل =

وفي «الفتاوى البَزَّازِيَة»(١) في فتاوى القاضي: رفعُ الصوت بالذكر حرام، وقد صَحَّ عن ابن مسعود أنه سَمِعَ قوماً اجتمعوا في المسجد يُهَلِّلُونَ ويُصَلُّون على النبي صلى الله عليه وعلى آله وسلم جهراً، فراح إليهم فقال: ما عهدنا ذلك على عهد رسول الله، وما أراكم إلا مبتدعين، فما زال يَذكُرُ ذلك حتى أخرجهم من المسجد(٢).

فإن قلتَ: المذكور في «الفتاوى» أن الذكر بالجهر لو في المسجد لا يُمنَعُ، احترازاً عن الدخول تحت قوله تعالى: ﴿ومن أَظْلَمُ ممن مَنَع

في القرآن، وكان يرفع صوتَه في الدعاء. رواه أحمد ٤: ١٥٩ والطبراني، وإسنادهما حسن.

وعن ابن الأدرع قال: كنت أحرُسُ النبي ﷺ فخرج. . . ثم خرج ذات ليلةَ وأنا أحرُسُه، فأخذَ بيدِي، فمررنا على رجل يصلي يجهر بالقرآن، فقلت عسى أن يكون مُرَائياً، فقال النبي ﷺ: كلَّا، إنه أوَّابٌ. فنظرتُ فإذا عبدُالله ذو البِجَادين. رواه أحمد ٤: ٣٣٧ ورجاله رجالُ الصحيح». انتهى.

(١) ٦: ٣٧٨، وقد وقع في الأصل المطبوع تحريف في بعض الكلمات صححته من «الفتاوى البزازية» وأتممت بعض الجمل التي سَقَطَتْ.

(٢) قال الحافظ السيوطي في «نتيجة الفكر بالجهر بالذكر» ٢: ٣١ من «الحاوي للفتاوي»: بعدَ أن أَورَدَ الأحاديثَ التي تَشهَدُ لاستحبابِ الجَهْرِ بالذكر: «فإن قلتَ: فقد نُقِلَ عن ابن مسعود أنه رأى قوماً يُهلِّلون بـرفع الصوتِ في المسجد، فقال: ما أراكم إلا مبتدعين، حتى أخرجَهم من المسجد.

قلتُ: هذا الأثَرُ عن ابن مسعود يَحتاجُ إلى بيان سنده ومَنْ أخرجه من الأئمة الحُفَّاظ في كتبهم، وعلى تقدير ثبوته فهو مُعارَضٌ بالأحاديث الكثيرة المتقدمة، وهي مقدَّمة عليه عند التعارض». انتهى. وسينقلُ كلامه هذا المؤلِّفُ في ص ٤٢.

مساجدَ اللّه أن يُذكَرَ فيها اسْمُهُ﴾[١]، وصَنِيعُ ابنِ مسعود يُخالِفه.

قلتُ: الإخراجُ من المسجد لو نُسِبَ إليه بطريق الحقيقة، يجوزُ أن يكون ذلك لاعتقادِهم العبادةَ فيه، ولتعليمِ الناسِ بأنه بدعة، والفعلُ الجائز يجوز أن يكون غيرَ جائز لغَرَضٍ يَلْحَقُه، فكذا غيرُ الجائز يجوزُ أن يَجُوزَ لغَرَض، كما تَرَكَ رسولُ اللّه صلى اللّه عليه وسلم الأفضلَ تعليماً للجواز. وفي الأعراف في قوله تعالى: ﴿ادْعُوا رَبَّكُم تَضَرُّعاً وخُفْيَةً﴾[٢] أي اعبُدُوه وارفعوا إليه حوائجكم، والضَّرَاعَةُ: الذِّلَّةُ، والخُفيَةُ أن لا يَدخُلَه الرياء ﴿إنه لا يُحبُّ المعتدين﴾[٢] أي المشركين الذين يدعون غير اللّه تعالى.

وما رُوِيَ في الصحيح أنه عليه الصلاة والسلام قال لرافعي أصواتهم بالتكبير: «آرْبَعُوا على أنْفُسِكم، إنكم لا تَدْعُون أصَمَّ ولا غائباً، إنكم تَدْعُون سَمِيعاً قريباً» الحديث[٣]: يَحتمِلُ أنه لم يكن هناك في الرفع مَصْلَحة، فقد: رُوِيَ أنه كان في غَزاة، ولعلَّ عَدَمَ رَفْعِ الصوت في نحو بلادِ الحرب خُدْعَةٌ، ولهذا نُهِيَ عن الجَرَس في المغازي.

وأما رَفْعُ الصوتِ بالذكر فجائز كما في الأذانِ والخُطبة والحَجِّ، والاختلافُ في عَدَدِ تكبيرِ التشريق جهراً: لا يَدلُّ على أنَّ الجهرَ به بدعة، لأن الخلاف بناءً على كونه سنةً زائدة، فصار كما لو اختلفوا في

---

(١) من سورة البقرة، الآية ١١٤.

(٢) من سورة الأعراف، الآية ٥٥.

(٣) وسيأتي سَنَدُهُ وتمامُهُ وتخريجُه في ص ٣٢ ـ ٣٦.

أن سنة الأربع من الظهر بتسليمة أَوْلى أم بتسليمتين، وذلك لا يدل على أنها بتسليمتين بدعةٌ أو حرام. انتهى.

وفي «الفتاوى الخيرية»: سُئل من دمشق من الشيخ إبراهيم، فيما اعتاده السادةُ الصوفية، من حِلَقِ الذكر والجهرِ به في المساجد من جماعةٍ وَرِثُوا ذلك من آبائهم وأجدادهم، ويُنشِدون القصائد الصوفية، وثَمّ من يَعترِضُ عليهم ويقولُ: لا يجوزُ الإنشادُ، وكذا رَفْعُ الصوت بالذكر، فهل اعتراضُه مُوافِقٌ للحكم الشرعي؟

فأجاب: حِلَقُ الذكر، والجَهْرُ به، وإنشادُ القصائد، قد جاء في الحديث ما اقتضى طلَبَهُ، نحو: «وإنْ ذَكَرني في مَلأٍ ذَكرتُهُ في ملأٍ خيرٍ منه» رواه البخاري ومسلم والترمذي والنسائي وابن ماجه وأحمد بإسناد صحيح(١). والذِّكْرُ في الملأ لا يكون إلا عن جَهْر، وكذا حِلَقُ الذكر وطَوافُ الملائكةِ بها، وما وَرَدَ فيها من الأحاديث.

وهناك أحاديثُ اقتضَتْ طلَبَ الإسرار. والجمعُ بينهما: بأنَّ ذلك يَختلِفُ باختلافِ الأشخاصِ والأحوال، كما جُمِعَ بين الأحاديثِ الطالبةِ للجهر والطالبةِ للإسرار بقراءةِ القرآن، ولا يُعارِضُ ذلك حديثُ «خيرُ الذكر الخَفِي»(٢)، لأنه حيث خِيفَ الرياءُ، أو تأذِّي المُصلِّين أو النيام.

---

(١) عن أبي هريرة. البخاري ١٣: ٣٨٤، في كتاب التوحيد (باب قول الله تعالى: ويحذركم الله نفسه)، ومسلم ١٧: ٢ في كتاب الذكر (باب الحث على ذكر الله تعالى)، والترمذي ٥: ٥٨١ في كتاب الدعوات (باب في حسن الظن بالله عز وجل) وقال: حسن صحيح، والنسائي في «الكبرى» كما في «تحفة الأشراف» ٩: ٣٧٦، وابن ماجه ٢: ١٢٥٥ في كتاب الأدب (باب فضل العمل)، وأحمد في «المسند» ٢: ٣١٥.

(٢) تقدم تخريجه تعليقاً في ص ٢٤.

وذَكَر بعضُ أهلِ العلم أن الجهر أفضل حيث كلاهما ذِكْر، لأنه أكثرُ عَمَلاً لتعدِّي فائدتِهِ إلى السامعين، ويُوقِظُ قلبَ الذاكر.

وقولُهُ تعالى: ﴿واذكُرْ رَبَّكَ في نَفْسِك﴾[١] أُجِيبَ عنها بأنها مكية، كآيةِ الإسرارِ بالقراءةِ بقوله: ﴿ولا تَجْهَرْ بصَلاتِكَ ولا تُخافِتْ بها﴾[٢]، نَزَلَتْ لئلا يَسمَعَه المشركون فيَسبُّوا القرآنَ ومن أنزَلَه، وقد زال.

وبعضُ شيوخ مالكٍ وابنُ جرير وغيرُهما حَمَلوا الآية على الذكر حالةَ قراءةِ القرآن تعظيماً له، يَدُلُّ عليه اتصالُها بقوله تعالى: ﴿وإذا قُرِئَ القرآنُ﴾ الآية[٣].

وقالت السادة الصوفية: الأمرُ في الآية خاص به صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم، وأما غيرُهُ ممن هو مَحَلُّ الوَسْوَاسِ والخواطرِ الرديئة فمأمورٌ بالجهر، لأنه أشَدُّ في دَفْعِها، ويُؤيِّده حديثُ البَزَّار «من صلّى منكم بالليل فلْيَجْهَر بقراءتِه، فإن الملائكة تُصلِّي بصلاته وتَسْمَعُ لقراءته»[٤]. وتفسيرُ الاعتداء: بالجهرِ، في قوله تعالى: ﴿إنه لا يُحِبُّ المعتدين﴾[٥] مردودٌ، بأنَّ الراجحَ في تفسيره التجاوُزُ عن المأمور به، والتوفيقُ بين ما ورد في الجهرِ والإسرارِ بنحو ما قُرِّرَ واجبٌ.

---

(١) من سورة الأعراف، الآية ٢٠٥.

(٢) من سورة الإسراء، الآية ١١٠.

(٣) من سورة الأعراف، الآية ٢٠٤.

(٤) ذكره الهيثمي في «مجمع الزوائد» ٢: ٢٥٣، من حديث معاذ بن جبل، وقال: رواه البزّار وقال: في إسناده ابنُ مَعْدان لم يَسمع من مُعاذ. قلتُ ــ القائل الهيثمي: «وفيه من لم أجد مَنْ ترجَمَهُ». انتهى. فالحديث ضعيف.

(٥) من سورة الأعراف، الآية ٥٥.

فإن قلتَ: صَرَّح في «الخانية» بأنَّ رفع الصوت بالذكر حرام، لقوله عليه الصلاة والسلام: «خيرُ الذكر الخَفِيّ»[١].

قلتُ: وهو محمولٌ على الجهرِ الفاحشِ المُضِر. انتهى كلامُه.

وفي «الأشباه» لا يُكَبِّرُ جهراً إلا في مسائل: في عيدِ الأضحى، ويومَ عرفة، وبإزاء عَدُوٍ وقُطَّاعِ الطريق، وعند وقوع حريق، وعند المَخاوِف كلِّها، كذا في «غاية البيان». انتهى.

وفي «حواشي الطَّحْطَاوي لمَراقي الفَلَاح» اختُلِفَ هل الإسرار بالذكر أفضَلُ؟ فقيل: نعم، لأحاديثَ تَدلُّ على ذلك، وقيل: الجهر أفضل، لأحاديثَ كثيرة، وجُمِعَ بأنَّ ذلك يَختلِفُ باختلافِ الأحوال والأشخاص. انتهى ملخصاً.

وفي «البحر الرائق» في بحث التكبير في الطريق يومَ الفطر، بعد نقل عبارة «فتح القدير» وغيرِها: والحاصلُ أنَّ الجهر بالتكبير بدعة في كل وقت إلا في المواضع المستثناة.

وصَرَّح قاضي خان في «فتاواه» بكراهةِ الذكر جهراً، وتَبِعَه على ذلك صاحبُ «المُصَفَّى».

وفي «الفتاوى العَلَّامية»: تُمنَعُ الصوفيةُ من رفع الصوت والصَّفْق، وصَرَّح بحُرْمَتِه العَيْنيُّ في شرح «التُحفة»، وشَنَّعَ على مَنْ يفعله مُدَّعياً أنه من الصوفية، فاستَثْنَى من ذلك في «القُنْيَة» ما يفعله الأئمةُ في زمانه فقال: إمامٌ يَعتادُ كلَّ غَدَاةٍ مع الجماعة قراءةَ آيةِ الكرسي وآخِرِ البقرة

---

(١) تقدم تخريجه تعليقاً في ص ٢٤.

وشَهِدَ اللَّهُ ونحوِهِ جهراً: لا بأسَ به، والأفضلُ: الإخفاء، ثم قال: التكبيرُ جهراً في غير أيام التشريق لا يُسَنُّ إلا بإزاء العَدُوِّ واللصوص، وقاس عليه بعضُهم الحريقَ والمَخاوِفَ كلَّها، ثم رَقَمَ صاحبُ «القُنْيَة» برقم آخر وقال: قَاصٌّ عنده جَمْعٌ عظيم يرفعون أصواتهم بالتسبيح والتهليل جملةً لا بأسَ به. انتهى كلامُ صاحب البحر.

أقولُ وبالله التوفيق، ومنه الوصولُ إلى التحقيق: هذه عباراتُ أصحابنا، فانظرْ فيها كيف اضطربَتْ آراؤهم، واختلَفَتْ أقوالُهم، فمن مُجوِّزٍ، ومن مُحرِّمٍ، ومن قائلٍ: إنه بدعة، ومن قائل: إنه مكروه، والأصحُّ: هو الجوازُ ما لم يُجاوِزِ الحد، كما اختاره الخير الرملي.

ولنذكر أولاً ما استدلوا به على المَنْع مع ذكرِ ما يدفعه، ثم نُحرِّرُ أدلةَ الجواز، ونَعْقُبُه بدفع الاضطرابِ الواقع بين كلماتهم.

فاستمِعْ أنَّ القائلين بمنع الجهر بالذكر استدلوا بوجوه:

١ ــ منها: قولُه تعالى: ﴿واذكُرْ رَبَّك في نَفْسِك تضرُّعاً وخِيْفةً ودُونَ الجَهْرِ من القولِ بالغُدُوِّ والآصالِ﴾ الآية[١]، فإنَّ هذه الآية تَدُلُّ بالذكرِ خُفيةً، فيكونُ الجهرُ به ممنوعاً إلا في ما وَرَد به النص.

والجوابُ عن هذا الاستدلال بوجوه:

أحدُها: ما ذهب إليه السادة الصوفية بدليل لاحَ لهم وإن لم يظهر لنا، من أنَّ هذا الخطاب خاصٌّ بالنبي صلى الله عليه وعلى آله وسلم، فلا يَدخُل فيه غيرُه[٢].

---

(١) من سورة الأعراف، الآية ٢٠٥.

(٢) وهذا جوابٌ مردود لا يعول عليه.

وثانيها: أنَّ هذا الأمـ ـر للافتراض أو الوجوبِ حتى يَحرُمَ ضدُه أو يُكرَه، بل هو أمرٌ إرشاديّ .يُدك إليه قوله تعالى: ﴿تَضرُّعاً وخِيْفَة﴾.

وثالثُها: أنَّ هذه الآ .محمولة على سامع القرآن كما يدل عليه اتصالُه بقوله تعالى: ﴿وإذا قُرِىء القرآنُ فاستَمِعُوا لَهُ وأَنْصِتُوا لعلكم تُرْحَمُونَ﴾[1]. فالمعنى ‏‏اذكر ربَّكَ أيها المنصِتُ في نفسِكَ تضرُّعاً وخِيفَةً. وكذا أخرجه ابنُ جرير وأبو الشيخ عن ابن زيد، وقال السيوطي في «نتيجة الفِكْر»: كأنه لمّا أمر بالإنصاتِ خَشِيَ من ذلك البطالة، فنبَّهَ على أنه وإن كان مأموراً بالإنصاتِ، إلا أنه يُكلَّفُ بالذكر القلبي حتى لا يَغْفُلَ عن ذكر الله تعالى، ولذا خَتَم بقوله: ﴿ولا تَكُنْ من الغافلين﴾. انتهى. فلا دلالةَ في الآية على منع الجهر.

ورابعها: أنَّ هذه الآية تدلُّ على إثباتِ الجهرِ الغيرِ المُفْرِط لا على مَنْعِه، بناءً على ما فسَّرها الإمامُ الرازي في تفسيره، من أنَّ قوله: ﴿اذكُرْ ربَّكَ في نفسِكَ﴾ معناه: اذكُرْ خُفْيَةً وسِرّاً، ومعنى قوله: ﴿ودُونَ الجهرِ﴾ المُفْرِط، والمرادُ منه: أن يقع الذكرُ بحيث يكون بين المُخَافتةِ والجهر، كما قال الله تعالى: ﴿ولا تَجْهَرْ بصَلاتِكَ ولا تُخافِتْ بها وابْتَغِ بين ذلك سبيلاً﴾[2]. وعلى هذا تدلُّ الآيةُ على جواز السِّرِ والجهرِ كليهما، وأفضليةِ السرِّ للتضرُّع والخيفة.

٢ ــ ومنها: وهو أقواها: ما رواه ابن أبي شيبة وأحمد بن حنبل وابن مَرْدُوْيَه والبيهقي في كتاب «الأسماء والصفات» عن أبي موسى

---

(١) من سورة الأعراف، الآية ٢٠٤.

(٢) من سورة الإسراء، الآية ١١٠.

الأشعريِ رضي الله تعالى عنه، قال: «كنا مع رسول الله صلى الله عليه وعلى آله وسلم في غَزاةٍ، فجَعلْنا لا نَهبِطُ وادياً، ولا نصعَدُ شَرَفاً، إلا رَفعْنا أصواتنا بالتكبير، فدَنا منا وقال: «يا أيها الناس، ارْبَعُوا على أنفسِكم، فإنكم لا تَدْعُون أصمَّ ولا غائباً. إنما تَدْعُون سميعاً بصيراً، إن الذي تدعون أقربُ إليكم من عُنقِ راحلةِ أحدِكم».

وهذا الحديث مُخرج في الصِّحاحِ الستة أيضاً[١]:

فروى الترمذي في كتاب الدعوات[٢]، في (باب فضل التسبيح وغيره) عن محمد بن بشار، عن مَرْحُوم بن عبدالعزيز العَطَّار، حدثنا أبو نَعامة السَّعْدي، عن أبي عثمان النَّهْدي، عن أبي موسى قال: «كنا مع رسول الله في غَزاةٍ، فلَمَّا قَفَلْنا أشرفنا على المدينة، فكبَّر الناسُ تكبيرةً، ورفعوا بها أصواتَهم، فقال: إنَّ ربكم ليس بأصمَّ ولا غائبٍ، هو بينكم وبين رُؤوسِ رِحالِكم، ثم قال: «يا عبدَالله بنَ قيس، ألا أُعلِّمُك كَنْزاً من كنوز الجنة: لا حَوْلَ ولا قُوَّةَ إلا بالله». قال الترمذي: هذا حديثٌ صحيحٌ، والنَّهْديُّ اسمُهُ: عبدالرحمن، وأبو نَعامة اسمُه: عَمْرو بن عيسى[٣]، ومعنى قوله: هو بينكم يعني عِلمَهُ وقُدْرَته. انتهى.

---

(١) يعني «الكتب الستة»، وتسميتُها جميعاً (الصِّحاحَ) تساهل قديم. فإن الصحاح منها: «صحيح البخاري» و«صحيح مسلم»، والباقي لم يُلتزَم فيه الصحاح كما هو معروف.

(٢) من «جامعه» ٥: ٤٥٧ في (باب ما جاء في فضل الدعاء)، وقال: حديث حسن. وفي (باب فضل التسبيح) ٥: ٥٠٩، وقال: حسن صحيح.

(٣) قال الحافظ المزي في «الأطراف» ٦: ٤٢٦ «ووهِمَ في ذلك ـ يعني الترمذي ـ والصحيحُ أن اسمه عَبْدُرَبِّه كما قال مسلمٌ وغيرُ واحد، وأما عَمْرو بن عيسى فهو أبو نَعامة العَدَوي، وهو شيخٌ آخر، والله أعلم».

ورَوَى مسلم[1] في (باب استحباب خفض الصوت بالذكر) من (كتاب الذكر) حدثنا محمد بن فُضَيل وأبو معاوية، عن عاصم، عن أبـي عثمان، عن أبـي موسى قال: كنا مع رسول الله في سفر، فجعَلَ الناس يَجهرون بالتكبير، فقال: يا أيها الناس، آرْبَعُوا على أنفسِكم، إنكم ليس تدْعُون أصمَّ ولا غائباً، إنكم تَدْعُون سميعاً قريباً وهو معكم.. قال أبو موسى: وأنا خَلْفَهُ وأنا أقولُ: لا حولَ ولا قوة إلا بالله، فقال: «يا عبدالله، ألا أدلُّك على كنزٍ من كنوز الجنة؟ فقلتُ: بلى، فقال: لا حولَ ولا قوةَ إلا بالله».

حدثنا ابن نُمَير، وإسحاق بن إبراهيم، وأبو سعيد الأشج، عن حفص بن غِياث، عن عاصم بهذا الإسناد نحوَه.

حدثنا أبو كامل فُضَيل بن حسين، حدثنا يزيد بن زُرَيع، حدثنا التَّيْمِيُّ، عن أبـي عثمان، عن أبـي موسى أنهم كانوا مع رسول الله صلى الله عليه وعلى آله وسلم وهم يَصعَدون في ثَنِيَّةٍ، فجَعَلَ رجل كلَّما عَلاَ نادى: لا إله إلا الله، والله أكبر، فقال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: إنكم لا تُنادون أصمَّ ولا غائباً. الحديث.

حدثنا إسحق بن إبراهيم، أخبرنا الثقفي، حدثنا خالد الحذَّاء، عن أبـي عثمان، عنه قال: كنا مع رسول الله في غَزاةٍ، فذكَرَ الحديث، وقال: «والذي تَدْعُونَهُ أقربُ إلى أحدِكم من عُنُقِ راحلةِ أحدكم».

قال النووي في «شرح صحيح مسلم»[2]: قولُه: (آرْبَعُوا) بهمزةِ وَصْل، وفتح الباء الموحَّدة، معناه: ارْفُقوا بأنفسِكم، وآخفِضُوا

---

(١) ١٧: ٢٥.

(٢) ١٧: ٢٦.

أصواتكم، فإنَّ رفع الصوت إنما يفعله الإنسانُ لبُعْدِ من يخاطبه، ففيه الندبُ إلى خفضِ الصوت بالذكر إذا لم تَدْعُ حاجةٌ إلى رفعِه، فإنه إذا خفضه كان أبلغَ في توقيرِهِ وتعظيمِه، فإن دَعَتْ حاجةٌ إلى الرفع رَفَع. انتهى.

ورَوَى أبو داود[1] في (باب الاستغفار) من كتاب الصلاة، عن موسى بن إسماعيل، قال حدثنا حماد، عن ثابت، وعليِّ بنُ زيد، وسعيدٌ الجُرَيْري، عن أبي عثمان، أنَّ أبا موسى قال: كنتُ مع سول اللَّه صلّى اللَّه عليه وسلم في سَفَر، فلما دَنَوْا من المدينة كبَّر الناسُ ورَفَعُوا أصواتَهم، فقال: «يا أيها الناس، إنكم لا تَدْعُون أصمَّ ولا غائباً، إنَّ الذي تَدْعُوْنَهُ بينكم وبين أعناقِ رِكابِكم، ثم قال: يا أبا موسى، ألا أدلُّك على كنزٍ من كنوز الجنة». الحديث.

حدثنا مُسَدَّد، حدثنا يزيد بن زُرَيع، حدثنا سليمان التَّيْمِي، عن أبي عثمان، عنه: «أنهم كانوا مع رسول اللَّه صلّى اللَّه عليه وسَلم وهم يتصعدُّون في ثَنِيَّة، فجعَلَ رجلٌ كلَّما عَلاَ الثنيَّةَ». الحديث، مثلُ رواية مسلم.

حدثنا أبو صالح، حدثنا أبو إسحاق الفَزَاري، عن عاصم، عن أبي عثمان، عنه بهذا الحديث، وقال فيه: «يا أيها الناس، آرْبَعُوا على أنفسكم». كما رواه مسلم.

ورَوَى البخاري[2] في (باب ما يكره من رفع الصوت في التكبير) من كتاب السِّيَر: حدثنا محمد بن يوسف، حدثنا سفيان، عن عاصم

---

(١) ٢: ١٨٢.

(٢) ٦: ١٣٥ من «فتح الباري».

الأحول، عن أبي عثمان، عنه، قال: كنا مع رسول الله صلّى الله عليه وسلم، فكنا إذا أشرفنا على وادٍ كبَّرنا وهلَّلنا وارتفعتْ أصواتُنا، فقال: يا أيها الناس، آربَعُوا على أنفسكم. الحديث مثلُ رواية مسلم.

قال القَسْطَلَّاني في «إرشاد الساري»[١]: قال الطبري: فيه كراهِيَةُ رفع الصوت بالذكر والدعاء، وبه قال عامَّةُ السلف من الصحابة والتابعين. انتهى.

ورواه ابنُ ماجه والنسائي أيضاً[٢]، على ما حكاه السيوطي، فهذا الحديث يدلُّ على أنه صلّى الله عليه وعلى آله وسلم كَرِهَ رفع أصواتِهم بالذكر، فلو لم يكن حراماً لا أقلَّ من أن يكون مكروهاً.

والجوابُ عنه من وجهين:

أحدهما: أنَّ الأمر في «آرْبَعوا» ليس للوجوب حتى يُكرَهَ الجهرُ أو يَحرم، وكيف ومعنى الرَّبْع يُنبِئُ عن أنَّ الأمر إنما هو للتيسير عليهم، ولذا قال الشيخ الدِّهْلَوِي في «اللَّمعات شرح المِشكاة» في قوله: «آرْبَعوا» إشارةٌ إلى أنَّ المنع من الجهر للتيسيرِ والإرفاق، لا لكون الجهر غير مشروع. انتهى. فلا يَثبُتُ من ذلك إلا استحبابُ السر، ولا كلام فيه.

---

(١) ٥ : ١٣٥.

(٢) رواه النسائي في «الكبرى» كما في «تحفة الأشراف» للمزي ٦ : ٤٢٦، و«عمل اليوم والليلة» ص ٣٦٤. أما ابن ماجه فلم يروه في كتاب «السنن» بهذا اللفظ، وإنما روى حديثاً عن أبي موسى في فضل (لا حول ولا قوة إلا بالله) ٢ : ١٢٥٦. ولهذا قال المؤلف: (على ماحكاه السيوطي).

وإلى هذا أشار مسلمٌ في «صحيحه» بعنوان الباب[١]، والنوويُّ في «شرحه».

وثانيهما: بأن جهرهم كان مُفرِطاً كما يدل عليه سياقُ بعض الروايات، قال في «فتح الودود شرح سنن أبي داود»: في قوله «رَفَعُوا أصواتَهم» دلالةٌ على أنهم بالغوا في الجهر، فلا يَلزمُ منه المنعُ من الجهر مطلقاً. انتهى.

وقال علي القاري في «الحِرز الثمين شرح الحِصن الحصين» في شرح «وإنْ ذَكَرني في ملأ» الحديث: هذا يَحتمِلُ أن يكون المرادُ به الذكر خُفْيَةً، كما يشير إليه حديثُ «ذاكرُ اللّه في الغافلين بمنزلة الصابر في الفارّين»[٢]، ويَحتمِلُ أن يكون المعنى مع مَلأ، وهو لا يفيد جواز الجهر الخارج عن الحد، فإنه صلى اللّه عليه وعلى آله وسلم قال لبعض أصحابه حين رفعوا أصواتهم على وجه المبالغة: «آرْبَعُوا على أنفسِكم» انتهى.

ووجهٌ ثالث: هو أنه لو لم يَمنعهم رسولُ اللّه صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم بل قرَّرهم عليه، لتوهَّموا أنَّ رفع الصوت بالذكر في السفر

---

(١) عناوين أبواب صحيح مسلم ليست من صُنع مسلم ولا تأليفه، وإنما عَنْوَن مسلمٌ للكتب فقط. فما قاله المؤلف هنا: كَبْوَةُ خاطر، من إمام ماهر. وعناوين الأبواب التي في «شرح النووي» هي من صُنع النووي رحمه اللّه تعالى، كما أشار إلى ذلك في فصول مقدمته لشرح «صحيح مسلم» ١: ٢١، في الفصل ١٠.

(٢) قال الهيثمي في «مجمع الزوائد» ١٠: ٨٠ «رواه الطبرانيُّ في الكبير والأوسط والبزّارُ من حديث عبداللّه بن مسعود، ورجالُ الأوسط وُثِّقوا».

أو عند صعودِ الثَّنِيَّة مسنون، فإن السُّنِّيَّةَ كما تَثبُتُ بالفعلِ والقولِ، كذلك تَثبُتُ بالتقرير، وليس كذلك، فلذلك نَهى رسول الله عنه سداً للذرائع، وتيسيراً على الأُمَّة، ولا دلالَةَ على منع الجهر مطلقاً كما لا يَخفى.

وأما الجوابُ عن هذا الاستدلال بأن النهي عنه إنما صَدَر منه لأنه لم تكن هناك مصلحة، وكان في سَفَر الغَزْوَة فخاف أنهم لو رفعوا أصواتهم لسَمِعَه الكفار فيُفضِي إلى البلاء، وقد ثَبَتَ أن «الحربُ خُدعة»[١] كما ذكره البزَّازي، فغيرُ صحيح ـ لما علمتَ من سياق الروايات ـ أن ذلك إنما كان عند القفولِ من الغزوة.

نعم، وقع في رواية البغوي في «معالم التنزيل» ما يوهم خلافه، فقال: حدثنا أحمد بن عبدالله، حدثنا محمد بن يوسف، أخبرنا إسماعيل، أخبرنا عبدالواحد، عن عاصم، عن أبي عثمان، عن أبي موسى قال: لمَّا غزا رسول الله صلى الله عليه وسلم خيبر، وتوجَّه إلى خيبر، أشرف الناسُ على واد، فرفعوا أصواتهم بالتكبير: اللَّهُ أكبر، اللَّهُ أكبر، لا إله إلا الله، فقال رسول الله: آرْبَعوا على أنفُسِكم. الحديث.

فهذه الرواية تُوهِمُ أن ذلك كان حين التوجه إلى خيبر، لكنَّ أكثر الروايات الصحيحة دالَّةٌ على أنه كان عند الرجوع من الغَزْوَةِ، والقُربِ من المدينة الطيبة. هذا ما خَطَر بالبال، والله أعلم بحقيقة الحال.

٣ ـ ومنها: قوله تعالى: ﴿ولا تَجْهَرْ بصَلاتِكَ ولا تُخافِتْ بها وابْتَغِ بين ذلك سبيلاً﴾[٢].

---

(١) هو حديثٌ متواترٌ جاء عن ١٧ صحابياً.

(٢) من سورة الإسراء، الآية ١١٠

والجوابُ عنه من وجوه:

أحدُها: أن هذه الآيةَ لا تَمنعُ الجهرَ مطلقاً، بل الجهرَ المُفرِط لقوله: ﴿وابْتَغِ بَيْنَ ذلك سبيلاً﴾، فكانت دليلاً للمجوِّزين لا لكم.

وثانيها: أنَّ هذه الآية نَزلَتْ لمَّا كان رسول اللَّه صلَّى اللَّه عليه وعلى آله وسلم مختفِياً بمكة، فكان إذا صلَّى جَهَرَ فسَمِعَه المشركون فسَبُّوا القرآنَ ومن أنزلَه، فنهاه اللَّه تعالى عن ذلك، وقال: ﴿ولا تَجْهَرْ بصَلاَتِكَ﴾ أي بقراءتِك القرآنَ في الصلاة، لئلا يَسمعَه المشركون فيَسُبُّونه، ﴿ولا تُخافِتْ بها وابْتَغِ بين ذلك﴾ أي الجهرَ الجهيرَ والسِّرَّ الكثير ﴿سبيلاً﴾. كذا أخرجه البخاري والترمذي، وقال: حسن صحيح عن ابن عباس[1].

فالمنعُ إنما كان لإيذاءِ المشركين وسَبِّهم، وقد زال هذا، فيَزُولُ المنعُ أيضاً.

ونظيرُهُ قوله تعالى: ﴿ولا تَسُبُّوا الذين يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْواً بغيرِ عِلْم﴾[2]، فنَهَى عن سَبِّ الأصنام والذين يَدْعُون، لأنهم كانوا يَسبُّون اللَّه، تعالى عن ذلك، وقد زال هذا المعنى فزال هذا النهيُ. أشار إليه ابنُ كثير في تفسيره[3].

---

(۱) في «صحيح البخاري» ۸: ٤٠٥ في كتاب التفسير (باب ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت)، و«جامع الترمذي» ٥: ٣٠٧ في كتاب التفسير (باب: ومن سورة بني إسرائيل).

(۲) من سورة الأنعام، الآية ۱۰۸.

(۳) ۳: ۷۸، وهو بمعناه.

وثالثها: أن هذه الآية نَزَلَتْ في الدعاء في التشهد، كما أخرجه الطبري وابن خزيمة والحاكم، عن عائشة رضي اللّٰه تعالى عنها، فلا دلالة لها على مَنْع الجهر بالذكر مطلقاً.

لا يُقالُ: رَوى البخاري عن عائشة أنها قالت: أُنزِلَ قولُه تعالى: ﴿ولا تَجْهَرْ بصَلاتِكَ﴾ الآية في الدعاء. ورَوى ابنُ مردويه من حديث أبـي هريرة قال: «كان رسـول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وعلى آلـه وسلم إذا صلَّى عند البيتِ رَفَعَ صوتَه بالدعاء»، فنزلَتْ هذه الآية. وليس في هاتين الروايتين تخصيصُ الدعاء بالتشهد، فيُعْلَمُ منه منعُ الجهر مطلقاً.

لأنا نقول على تقدير تسليم دلالتها على منع الجهر مطلقاً، وإن كان غيرَ مِفْرِط: الآيَةُ إنما هي في الدعاء لا في الذكر مطلقاً، والدعاءُ بخصوصه السِّرُّ فيه أفضَلُ، لأنه أقربُ إلى الإجابة إلا عند الضرورة كما في «البزَّازية»: المذكِّرُ إذا دعا بالدعاء المأثور جهراً، وجَهَر معه القومُ كي يتعلموا لا بأسَ به، وإذا تعلموا حينئذ يكون جهرُهم بدعة. انتهى.

ولذا قال اللّٰه تعالى في قصة زكريا على نبينا وعليه الصلاة والسلام: ﴿إِذْ نَادَى رَبَّهُ نِداءً خَفِيـاً﴾[1]، ومن ثَمَّ استُحِبَّ الإسرارُ بالاستعاذة في الصلاة اتفاقاً، لأنه دعاء، والمطلوبُ إنما هو منعُ الجهر بمطلَقِ الذكر، فلا يتم التَّقْرِيبُ.

٤ ــ ومنها قولُه تعالى: ﴿ٱدْعُوا رَبَّكم تَضَرُّعاً وخُفْيَةً، إنه لا يُحبُّ

---

(١) من سورة مريم، الآية ٣.

(٢) كذا في الأصل المطبوع. ولم يتضح لي المرادُ منه إن كان غيرَ محرَّف.

المُعْتَدِين﴾[١]، فقد فسَّر زيدُ بن أسلم الاعتداءَ بالجهر، كما أخرجه ابن أبـي حاتم، وأخرج ابنُ جرير وأبو الشيخ نحوَه عن ابن جُرَيج.

والجوابُ عنه من وجهين:

أحدُهما: ما ذكرنا آنفاً من أنَّ للدعاء خصوصيةً ليست لغيره من الأذكار، فلا يدل منعُ الجهر به على منع الجهر بالذكر مطلقاً.

وثانيهما: أنه جاءَتْ في تفسير الاعتداء أقوالٌ أُخَر أيضاً، فأخرج ابنُ أبـي حاتم عن سعيد بن جُبَير أنه قال في قوله تعالى: ﴿لا يُحبُّ المُعْتَدِين﴾ يقول: لا تَدْعُوا على المؤمنِ والمؤمنةِ بالشر، فإنَّ ذلك عُدْوَان.

وأخرج ابن جرير وابن أبـي حاتم، عن أبـي مِجْلَز في قوله تعالى: ﴿لا يُحِبُّ المعتدين﴾ يقول: لا تَسألوا مَنازِلَ الأنبياء.

والراجحُ في تفسيره على ما أشار إليه السيوطي في «نتيجة الفِكْر» والخيرُ الرمليُّ وغيرُهما: أنَّ المرادَ بالاعتداء أن يُجاوِزَ المأمورَ به، ويَختَرِعَ دعوةً لا أصلَ لها في الشرع، كما يدل عليه ما رواه ابن أبـي شيبة، وعبدُ بن حُمَيد، وأبو داود، وابن ماجه، وابن حبان، والحاكم، والبيهقي[٢] عن عبدالله بن مُغَفَّل أنه سمع ابنه يقول: اللهم إني أسألك القَصْرَ الأبيضَ، عن يمينِ الجنة إذا دخلتُها، فقال: أي بُنَيْ،

---

(١) من سورة الأعراف، الآية ٥٥.

(٢) أبو داود ١: ٧٣ في كتاب الطهارة (باب الإسراف في الماء)، وابن ماجه ٢: ١٢٧١ في كتاب الدعاء (باب كراهية الاعتداء في الصلاة)، والحاكم ١: ١٦٢ في كتاب الطهارة، وقال الذهبي: فيه إرسال.

سَلْ اللَّه الجنة، وتَعوَّذْ به من النار، فإني سمعتُ رسول اللَّه صلّى اللَّه عليه وعلى آله وسلم يقول: «سيكونُ في هذه الأمة قومٌ يَعْتَدُون في الدعاءِ والطَّهُور».

وأخرج الطَّيَالِسيُّ، وابنُ أبـي شيبة، وأحمـدُ، وأبو داود، وابنُ المنـذر، وابن أبـي حاتم، وأبـو الشيخ، وابنُ مـردويـه عن سعـد بن أبـي وَقَّاص[١] أنه سَمِعَ ابناً له يدعو ويقول: اللهم إني أسألُك الجنَّة ونعيمَها وإِسْتَبْرَقَها، وأعوذُ بك من النار وسَلاَسِلِها وأغلالِها.

فقال: لقد سألتَ اللَّه خيراً كثيراً، وتعوَّذتَ من شر كثير، وإني سمعتُ رسول اللَّه يقول: «سيكون قومٌ يَعْتَدُون في الدعاء» وقرأ قولَه تعالى: ﴿إنَّه لا يُحِبُّ المُعْتَدِين﴾، وحَسْبُك أن تقول: «اللهم إني أسألُك الجنةَ وما قَرَّبَ إليها من قولٍ أو عَمَل، وأعوذُ بك من النار وما قَرَّبَ إليها من قولٍ أو عمل». وعلى هذا التفسير الراجح لا تكون الآية مما نحن فيه.

٥ ـ ومنها[٢]: إخراجُ ابن مسعود رافعي أصواتِهم في المساجد، وقولُه لهم: ما أراكم إلا مبتدعين.

والجواب عنه من وجوه:

أحدُها: أن هذا الأثر وإن ذَكَره جمعٌ من الفقهاء، لكن لم يوجد له أثر في كتب الحديث، بل الثابتُ عنه خلافُه.

---

(١) أبو داود ٢: ١٦١ في كتاب الصلاة (باب الدعاء)، والإمام أحمد ١: ١٧٢ و ١٨٣.

(٢) أي ومن أدلةِ المانعين من الجهر بالذكر: إخراجُ ابن مسعود الذين رفعوا أصواتهم بالذكر في المسجد، من المسجد، وإنكارُهُ ذلك عليهم.

قال السيوطي في «نتيجة الفِكر» هذا الأثر عن ابن مسعود يَحتاجُ إلى بيانِ سندِهِ ومن أخرجه من الحفاظ في كتبهم، ورأيتُ ما يقتضي إنكار ذلك عن ابن مسعود، وهو ما رواه أحمد بن حنبل في كتاب «الزهد»، حدثنا حسين بن محمد بسنده، عن أبي وائل، قال: هؤلاء الذين يَزعُمون أن عبدالله كان يَنْهَى من الذكر، ما جالستُ عبدالله مجلساً قط إلا وذَكر الله فيه. انتهى كلامُه.

وثانيها: أنه على تقدير ثبوتِهِ مُعارَضٌ بالأحاديث الصحيحة الصريحة، في جوازِ الجهر الغيرِ المُفْرِط، وهي مقدَّمة عليه عند التعارض.

وثالثها: ما ذكره البَزَّازِي في «فتاواه» على ما مَرَّ ذكره[١].

٦ ــ ومنها: ما رواه البيهقي في «شُعَب الإيمان»، وابنُ حِبَّان، وأحمد في «مسنده»، عن سَعْد بن مالك بسند صحيح مرفوعاً: «خيرُ الذكر الخفي، وخيرُ الرزق ما يكفِي»[٢]. فإنَّ هذا الحديث يدل على أن الذكر الجهري شَرّ، والشرُّ لا يكون إلا حراماً أو مكروهاً.

والجوابُ عنه أن هذا لا يدل على منع الجهر بل على أفضلية السِّر، ولا كلامَ فيه، وذلك لأن لفظَ الخير له استعمالانِ على ما ذكره صاحبُ «الصحاح» وغيرُه:

أحدُهما: أن يُراد به معنى التفضيل لا الأفضلية، وضده حينئذ شر.

---

(١) في ص ٢٧، من أن يكون ذلك لاعتقادهم العبادة فيه. . .

(٢) وتقدم تخريجه أيضاً، في ص ٢٤.

وثانيهما: أن يراد به معنى الأفضلية، وحينئذ فأصلُهُ أَخيَر، حُذِفت همزتُه تخفيفاً.

وقد سُئِل السيوطي عن حديث: «حَياتي خير لكم، ومَماتي خير لكم»[١] من أن كيف يمكن أن يكون كل منها خيراً من الآخر؟

فأجاب: بأنَّ للخير استعمالين، فالخيرُ في هذا الحديث بالاستعمال الأول، فيُرادُ به التفضيلُ، لا الأفضلية، والمقصود أنَّ في كل من حياته وموته صلّى الله عليه وعلى آله وسلم خيراً.

إذا عَرفتَ هذا فنقول: الخيرُ في قوله: «خيرُ الذكر الخفِيّ»، ليس بالمعنى الأول، بل بالمعنى الثاني، فيكون المطلوب أنَّ في الذكر الخفي زيادةَ خير، وفي الجهر أقلَّ منه، لا أنَّ الجهرَ شر كما فَهِم المستدلُّ.

والباعثُ على حمله على هذا المطلوب وُرودُ الأحاديثِ الصريحةِ في جواز الجهر، كما ستَقِفُ عليه، فافهم فإنه فائدة لطيفة.

وأما القائلون بجواز نفس الجهر فاحتجوا بوجوه قوية:

الأول: ما رواه البخاري ومسلم والترمذي والنسائي وابن ماجه والبيهقي في «شعب الإيمان»، عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه[٢] قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم: يقول الله: «أنا عند ظنِّ عبدي بي، وأنا معه إذا ذكرني، فإن ذكرني في نفسِهِ ذكرتُه في نفسي، وإن ذكرني في ملأ ذكرتُه في ملأ خيرٍ منهم، وإن تقرَّب إليَّ شِبْراً

---

(١) رواه البزَّارُ مرفوعاً عن ابن مسعود، قال الهيثمي في «مجمع الزوائد» ٩: ٢٤ «رجاله رجالُ الصحيح». وانظر شرح الخيرية في «فيض القدير» للمُناوي ٣: ٤٠٠.

(٢) تقدم تخريج هذا الحديث في صـ ٢٨.

تقرَّبتُ إليه ذِرَاعاً، وإن تقرَّب إليَّ ذراعاً تقرَّبتُ إليه باعاً، وإن أتاني يمشي أتيتُه هرولة».

قال الحافظ عبدالعظيم المنذري في «كتاب الترغيب والترهيب»[١]: ورواه أحمد بإسناد صحيح، وزاد في آخره: قال قتادة: «واللَّهُ أسرَعُ بالمغفرة». انتهى.

وقال العلامة الجَزَري في «مفتاح الحِصن الحَصِين»: فيه دليلٌ على جواز الجهر بالذكر، خلافاً لمن مَنَعه، واستَدَلَّ به المعتزلةُ على تفضيل الملائكة على الأنبياء، ولا دليلَ فيه، لأنَّ الأنبياء لا يكونون غالباً في الذاكرين. انتهى كلامه.

وقال السيوطي: الذكرُ في الملأ لا يكون إلا عن جهر، فَدَلَّ الحديثُ على جوازِه. انتهى.

الثاني: ما رواه الترمذي والنسائي وابن ماجه والبزار والبيهقي في «شعب الإيمان» وابن أبي الدنيا في «كتاب الذكر» عن ابن عباس مرفوعاً: «قال اللَّه تعالى يا ابنَ آدم إذا ذكرتَني خالياً ذكرتُك خالياً، وإذا ذكرتني في ملأ ذكرتك في ملأ خيرٍ من الذين تَذْكُرني فيهم وأكثَرَ»[٢].

---

(١) ٣: ٢٠١.

(٢) هذا الحديث أورده الحافظ السيوطي في «نتيجة الفكر في الجهر بالذكر» ٢: ٢٦ من «الحاوي للفتاوي»، وعزاه إلى مُخرجه بقوله: «أخرج البزَّار والبيهقي بسندٍ صحيح عن ابن عباس قال، قال رسول اللَّه ﷺ: ...». انتهى.

وهذا هو الصواب في عَزْوِه، فإنه وقع هنا في كلام المؤلف عَزْوُه إلى (الترمذي والنسائي وابن ماجه) زيادة على (البزَّار والبيهقي). وهذه الزيادة خطأ، ولعلها من الناسخ؟ فإني لم أجد الحديث المذكور عند هؤلاء الأئمة الثلاثة في كتبهم.

الثالث: ما رواه الطبراني عن معاذ بن أنس مرفوعاً: «قال اللّه تعالى: لا يَذكُرُني أحدٌ في نفسه إلا ذكرتُه في ملأ من ملائكتي، ولا يَذكُرُني في ملأ إلا ذكرتُه في الملأ الأعلى». قال المنذري: إسناده حسن[١].

الرابع: ما رواه أحمد والبيهقي في «الأسماء والصفات» عن أنس مرفوعاً[٢]: «قال اللّه تعالى: يا ابنَ آدم إن ذكرتَني في نفسِك ذكرتُك في نفسِي، وإن ذكرتني في ملأ ذكرتُك في ملأ خير منهم، وإن دنوتَ مني شبراً دنوتُ منك ذِراعاً».

الخامس: ما رواه البخاري ومسلم والبيهقي في «الأسماء والصفات» عن أبي هريرة مرفوعاً[٣]: «إن للّهِ ملائكةً يطوفون في

ويُعزِّز أنه لم يرووه أن الحافظ المنذري ذكر هذا الحديث في «الترغيب والترهيب» ٣:٢٠١، وقال: «رواه البزار بإسنادٍ صحيح». انتهى. وكذلك عزاه الحافظ الهيثمي في «مجمع الزوائد» ١٠:٧٨ إلى البزَّار، وقال: «رجالُه رجالُ الصحيح غير بِشْر بن معاذ العَقَدي، وهو ثقة». انتهى. وهذا يؤيد خلو الكتب الثلاثة من هذا الحديث، لأنه لو كان فيها لما أدخله الهيثمي في «مجمع الزوائد».

(١) قال المنذري ذلك في «الترغيب والترهيب» ٣:٢٠٢. وكذلك قال الهيثمي في «مجمع الزوائد» ١٠:٧٨.

(٢) أحمد ٣:١٣٨، وقال الهيثمي ١٠:٧٨ «ورجالُه رجالُ الصحيح».

(٣) البخاري ١١:٢٠٨ في كتاب الدعوات (باب ذكر فضل اللّه عز وجل)، ومسلم ١٧:١٤ في كِتاب الذكر والدعاء (باب فضل مجالس الذكر). واللفظ المذكور هنا أقربُ إلى رواية البخاري.

الطرق، يلتمسون أهلَ الذكر، فإذا وجدوا قوماً يذكرون الله تنادَوْا هَلُمُّوا إلى حاجَتِكم، فيحفونهم بأجنحتهم إلى السماء، فإذا تفرَّقوا عَرَجوا وصَعِدُوا إلى السماء، فيَسألهم ربُّهم ـ وهو أعلَمُ بهم ـ من أين جئتم؟ فيقولون: جئنا من عندِ عَبِيدٍ في الأرض يُسبِّحونَك ويُكبِّرونك ويُهلِّلونك، فيقول: هل رأوني؟ فيقولون: لا، فيقول: لو رأوني؟ فيقولون: لو رأوك كانوا أشدَّ لك عبادة، وأشدَّ لك تمجيداً، وأكثَرَ لك تسبيحاً.

فيقول: فما يَسألوني؟ فيقولون: يَسألونك الجنة، فيقول: وهل رأوها؟ فيقولون: لا، فيقول: فكيف لو رَأَوْها؟ فيقولون: لو أنهم رأوها كانوا أشدَّ عليها حرصاً، وأشدَّ لها طَلَباً، وأعظَمَ فيها رغبة.

فيقول: فمم يتعوذون؟ فيقولون: من النار، فيقول: وهل رأوها؟ فيقولون: لا، فيقول: فكيفَ لو رَأَوْها؟ فيقولون: لو رأوها كانوا أشدَّ منها فراراً، فيقول: أُشهدكم أني قد غفرتُ لهم، فيقول ملك من الملائكة: فلان ليس منهم، إنما جاءهم لحاجةٍ، فيقول: هم قومٌ لا يَشقَى جليسُهم.

ورَوَى نحوَه ابنُ حبان والترمذيُّ وأبو نعيم في «حِلية الأولياء» وأحمدُ وغيرُهم[1].

السادس: ما رواه ابن أبي شيبة وأحمد ومسلم والترمذي والنسائى

---

(١) الترمذي ٥: ٥٧٩ في كتاب الدعوات (باب ما جاء أنَّ ملائكةً سَيَّاحين في الأرض)، وأحمد في «المسند» ٢: ٢٥٢، وأبو نعيم في «الحلية» ٨: ١١٧.

عن مُعاوية رضي اللّه تعالى عنه[١] «أن رسول اللّه صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم خرَج على حَلْقَةٍ من أصحابه فقال: ما أجلَسكم؟ قالوا: جَلَسْنا نذكُرُ اللّه ونَحمَدُه على ما هدانا للإسلام، ومَنَّ به علينا فقال: آللّهِ ما أجلَسَكم إلا هذا، قالوا: أَللّهِ ما أجلَسَنا إلا ذلك[٢]، فقال: أَمَا إني لم أستحلفكم تُهمةً لكم، ولكن أتاني جبريـلُ فأخبرني أنَّ اللّه عز وجل يُباهي بكم الملائكة.

السابع: ما رواه أحمد وأبـو يعلى [٣] وابن حبان والبيهقي عن أبـي سعيد الخدري رضي اللّه تعالى عنه أن رسول اللّه صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم قال: يقولُ اللّه يومَ القيامة: سَيَعْلَمُ أهلُ الجمع اليومَ مَنْ أهلُ الكَرَم اليومَ، فقيل: ومن أهْلُ الكرمِ يا رسول اللّه؟ فقال: أهلُ مَجَالِسِ الذكر.

الثامن: ما رواه أحمد [٤] عن أنس قال: كان عبداللّه بن رَوَاحة إذا

---

(١) مسلم ١٧: ٢٢ في كتاب الذكر والدعاء (باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر)، والترمذي ٥: ٤٦٠ في كتاب الدعوات (باب ما جاء في القوم يجلسون فيذكرون اللّه عز وجل ما لهم من الفضل)، وقال: «حسن غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه». والنسائي ٨: ٢٤٩ في كتاب آداب القُضاة (باب كيف يَستحلِف الحاكم)، وأحمد ٤: ٩٢.

(٢) لفظُة (آللّه) الأولى بالمدّ، لأنها فيها همزة الاستفهام مع هَمزة القَسَم المبدلة من باء القَسَم، فصارَتْ آللّهِ، أي أباللّهِ. ولفظةُ (أَللّهِ) الثانية من غير مدّ، وفيها همزةُ القسم المبدلةُ من باءِ القسم، أي بِاللّهِ.

(٣) أحمد في «المسند» ٣: ٦٨ و ٧٦. وقال الهيثمي ١٠: ٧٦ «رواه أحمد بإسنادين وأحدهما حسن وكذلك أبو يعلى».

(٤) في «المسند» ٣: ٢٦٥.

لَقِيَ الرجلَ من أصحاب رسول الله قال: تَعالَ نُـؤْمِن بربِّنا ساعةً، فقال ذاتَ يوم لرجل فغَضِبَ الرجلُ وجاء إلى رسول الله وقال: أتَرى إلى ابن رَوَاحة؟ يَرغَبُ عن إيمانِك إلى إيمانِ ساعة؟! فقال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: رَحِمَ الله ابنَ رَوَاحة، إنه يحب المَجالسَ التي تُبَاهِي بها الملائكة». قال المنذري في «كتاب الترغيب والترهيب»: إسنادُه حسن[١].

التاسع: ما رَوَى أبو يعلى والبزار والطبراني عن أنس قال رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم: «ما من قومٍ اجتمعوا يَذكُرون الله لا يُريدون بذلك إلا وَجْهَهُ، إلا ناداهم مُنادٍ من السماء: أن قوموا مغفوراً لكم، قد بَدَّلْتُ سَيِّئاتِكم حَسَنات». قال المنذري: ورواه أحمد برجالٍ يُحتجُّ بهم في «الصحيح» إلا ميموناً وثَّقَه جماعةٌ، وفيه ضعف[٢].

العاشر: ما رواه الطبراني عن سهل بن الحنظلية، قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم: «ماجَلَس قومٌ مجلساً يَذكُرون الله فيه، فيقومون حتى يقالَ لهم: قوموا قد غَفَر الله لكم»[٣].

---

(١) في «الترغيب» ٣: ٢١١. وكذلك قال الهيثمي ١٠: ٧٦.

(٢) هو: ميمون بن موسى المَرَئي. والحديث في «المسند» ٣: ١٤٢. وقال الهيثمي في «مجمع الزوائد» ١٠: ٧٦ «رواه أحمد وأبو يعلى والبزار والطبراني في الأوسط، وفيه ميمون المَرَئي، وثَّقَه جماعة، وفيه ضعف، وبقية رجال أحمد رجالُ الصحيح».

(٣) قال الهيثمي ١٠: ٧٦ «رواه الطبراني وفيه المتوكل بن عبدالرحمن والد محمد بن أبي السَّرِيّ، ولم أعرفه، وبقية رجاله ثقات». وله شواهد تقوِّيه.

الحادي عشر: ما رَوى البيهقي عن عبدالله بن مُغَفَّل رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم: «ما من قوم اجتمعوا يذكرون الله إلا ناداهم مُنادٍ من السماء: قُوموا مغفوراً لكم».

الثاني عشر: ما رواه أحمد ومسلم والترمذي وابن ماجه وابن أبي شيبة والبيهقي عن أبي هريرة وأبي سعيد رضي الله تعالى عنهما، أنهما شَهِدا على رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم أنه قال: «لا يَقعُدُ قوم يذكرون الله إلا حَفَّتْهم الملائكة، وغَشِيَتْهم الرحمةُ، ونَزَلَتْ عليهم السكينةُ، وذَكَرَهم الله فيمن عنده»(١).

الثالث عشر: ما رواه ابن أبي الدنيا عنهما مرفوعاً: «إنَّ لأهل ذكر الله أربعاً: تَنزِلُ عليهم السكينة، وتغشاهم الرحمةُ، وتَحُفُّ بهم الملائكة، ويَذكرُهم الله في ملأ عندَه».

الرابع عشر: ما رَوَى عبد بن حُمَيد في «مسنده» والحاكم عن جابر رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم: «إنَّ لله سَرَايا من الملائكة، تَحُلُّ وتَقِفُ على مَجالِس الذكر في الأرض»(٢).

---

(١) في «المسند» ٢:٤٤٢، ومسلم ١٧:٢٢ في كتاب الذكر والدعاء (باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر). والترمذي ٥:٤٥٩ في كتاب الدعاء (باب ما جاء في القوم يجلسون فيذكرون الله عز وجل ما لهم من الفضل). وقال: حسن صحيح. وابن ماجه ٢:١٢٤٥ في كتاب الأدب (باب فضل الذكر).

(٢) سيأتي تخريجه قريباً في ص ٥٢.

الخامس عشر: ما رواه أحمد والترمذي وحسَّنه عن أنس رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم: «إذا مررتم برياضِ الجنة فارْتَعُوا، قالوا: يا رسول الله، وما رياضُ الجنة؟ قال: حِلَقُ الذكر»[١].

قال الجَزَرِيُّ في «مفتاح الحِصن الحصين»: أراد بالرياضِ: الذِّكْرَ، وشَبَّهَ الخَوْضَ فيه بالرَّتْع. انتهى.

السادس عشر: ما رواه ابنُ النَّجار عن أبي هريرة مرفوعاً على ما أورده السيوطي في كتابه «الحَبَائك في أحوالِ المَلَائك»: «إنَّ للَّه تعالى سَيَّارةً من الملائكة، يَتبعون حِلَقَ الذكر، فإذا مَرُّوا قال بعضهم لبعض: اقْعُدوا، فإذا دَعَا القوم أَمَّنُوا على دعائهم، فإذا صَلَّوْا على النبي صلّى الله عليه وعلى آله وسلم صَلَّوْا معهم حتى يَفرُغوا، ثم يقولُ بعضهم لبعض: طُوبَى لهم، لا يَرجِعُون إلا مغفوراً لهم».

السابع عشر: ما رواه البزار عن أنس مرفوعاً: «إنَّ للَّهِ سَيَّارةً من الملائكة، يَطلبونَ حِلَقَ الذكر، فإذا أَتَوْا حِلَقهم حَفُّوا بهم، فيقولون: ربَّنا أَتَيْنا على عبادٍ من عبادك، يُعظِّمون آلاءَك، ويتلون كتابَك، ويُصلُّون على نبيك، ويَسألونك لآخرتِهم ودنياهم، فيقول الله: غَشُوهُمْ برحمتي، فهم الجُلَساء لا يَشقى بهم جَليسُهم»[٢].

---

(١) الترمذي ٥: ٥٣٢ في كتاب الدعوات وقال: «حديث حسن غريب من هذا الوجه من حديث ثابت عن أنس». و«مسند أحمد» ٣: ١٥٠.

(٢) قال الهيثمي في «مجمع الزوائد»: ١٠: ٧٧ «رواه البزار من طريق زائدة بن أبي الرقاد، عن زياد النميري، وكلاهما وُثِّقَ على ضعفه، فعاد هذا إسناده حسناً».

الثامن عشر: ما رواه أحمد عن ابن عَمْرو قال: «يا رسول الله، ما غَنِيمَةُ مجالس الذكر؟ قال: الجنة». قال المنذري: رواه أحمد بإسناد حسن[١].

التاسع عشر: ما رواه أبو يعلى والحاكم وصحَّحه والبيهقي في «الدعوات» عن جابر قال: «خَرج علينا رسولُ الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم فقال: يا أيها الناس، إنَّ للّهِ سَرَايا من الملائكة، تَحُلُّ وتَقِفُ على مجالس الذكر، فارْتَعُوا في رياضِ الجنة، قالوا: وما رياضُ الجنة؟ قال: مجالسُ الذكر، فاغْدُوا ورُوحوا في ذكر الله»[٢].

قال المنذري[٣]: وَرواه ابنُ أبـي الدنيا وغيرُه، وفي أسانيدهم كلِّها: عُمَر بنُ عبدالله مولى غُفْرَة، وقد ضعَّفه النسائي وابنُ معين، وقال أحمد: ليس به بأس، وبقيةُ رُواتِه يُحتَجُّ بهم، والحديث حسن.

العشرون: ما رواه الطبراني في «الصغير» بإسنادٍ حسن عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: «مرَّ رسولُ الله صلّى الله عليه وعلى

---

(١) في «المسند» ١: ١٧٧ و ١٩٠، وقال الهيثمي في «مجمع الزوائد» ١٠: ٧٨ «رواه أحمد والطبراني، وإسناده حسن». والمنذري في «الترغيب» ٣: ٢١٣.

(٢) الحاكم في «المستدرك» ١: ٤٩٤ في كتاب الدعاء، وقال «حديث صحيح الإسناد، ولم يخرجاه». وتعقَّبَه الذهبي فقال: «قلت: عُمَرُ ضعيف». انتهى. وقال الهيثمي ١٠: ٧٧ «رواه أبو يعلى والبزار والطبراني في الأوسط، وفيه عمر بن عبدالله مولى غُفْرة، وقد وثقه غير واحد، وضعفه جماعة وبقية رجالهم رجال الصحيح».

(٣) في «الترغيب» ٣: ٢١٣.

آله وسلم بعبدالله بن رَوَاحة وهو يُذكِّرُ أصحابَه[١]، فقال: أما إنكم الملأ الذين أمَرَني الله أنْ أصْبِرَ نفسي معكم، ثم تلا قوله تعالى: ﴿واصْبِرْ نفسَك مع الذين يَدْعُون رَبَّهم بالغَداةِ والعَشِيّ﴾ الآية[٢]، أمَا إنه ما جَلَس عِدَّتُكم إلا جَلَسَ مَعَهم عِدَّتُهم من الملائكة، إن سَبَّحوا الله سبحوه، وإن حَمِدوا الله حَمِدوه، ثم يَصْعَدُون إلى الرب ـ وهو أعلَمُ بهم ـ فيقولون: رَبَّنا عبادُك يُسبِّحونك، فسبَّحناك، ويَحْمَدُونك فَحَمِدناكَ، فيقول: يا ملائكتي، أُشهدكم أني قد غفرتُ لهم، فيقولون: فيهم فلان وفلان، فيقول: هم القومُ الذين لا يَشقى بهم جليسُهم»[٣].

الحادي والعشرون: ما رواه الطبراني عن عَمْـرو بن عَبَسَة[٤] رضي الله تعالى عنه، قال: سمعتُ رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم يقول: «عن يمينِ الرحمن ـ وكِلتا يديه يمين ـ رجالٌ ليسوا بأنبياءَ ولا شهداء، يَغْشَى بياضُ وجوهِهم نَظَرَ الناظرين، يَغبِطُهم النبيُّون والشهداءُ بمَقْعَدِهم وقُربِهم من الله تعالى، قيل: يا رسول الله، من هم؟ قال: هم جُمَّاعٌ من نَوَازع القبائل، يَجتمعون على ذِكرِ الله، فينتقون أطايبَ الكلام، كما يَنتقِي آكِلُ التمر أطايِبَهُ»[٥].

---

(١) وقع في الأصل (وهو يذكر مع أصحابه). وهو خطأ، صوابه كما أثبته: (وهو يُذَكِّرُ أصحابَه) كما في المراجع المنقولِ منها.

(٢) من سورة الكهف، الآية ٢٨.

(٣) هو في «المعجم الصغير» ٢: ١٠٩. وقال الهيثمي ١٠: ٧٦ «رواه الطبراني في الصغير، وفيه محمد بن حماد الكوفي، وهو ضعيف». انتهى. وأورده المنذري في «الترغيب» ٣: ٢١٢، وصدَّره بلفظ (ورُوِيَ) إشعاراً منه بضعفِه.

(٤) وقع في الأصل (عَمْرو بن عنبسة)، وهو تحريف.

(٥) قال الهيثمي ١٠: ٧٧ (رواه الطبراني ورجاله موثوقون).

قال المنذري[1]: إسناده مُقَارِبٌ لا بأس به، ومعنى قولِهِ: جُمَّاع بضم الجيم، وتشديد الميم، أخلاطٌ من قبائلَ شتى، ومواضعَ مختلفة. ونَوَازع: جَمْعُ: نازع، وهو الغريب، ومعناه: أنهم لم يجتمعوا لقرابة بينهم ولا نَسَبٍ ولا معرفة، وإنما اجتمعوا لذكر اللّٰه. انتهى.

الثاني والعشرون: ما رواه الطبراني بإسنادٍ حسَّنَهُ المنذري[2]، عن أبي الدرداء رضي اللّٰه تعالى عنه قال: قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وعلى آله وسلم: «لَيبعثن اللّٰهُ أقواماً يومَ القيامة، في وجوههم النور، على مَنابر اللؤلؤ، يَغْبِطُهم الناسُ، ليسوا بأنبياءَ ولا شهداء.

قال أبو الدرداء: فجَثَا أعرابي على ركبتَيْهِ وقال: صِفْ حِلْيَتَهم لنا نَعْرِفهم، فقال: «هم المُتحابُون في اللّٰه من قبائلَ شَتَّى، وبلادٍ شَتَّى، يجتمعون على ذكرِ اللّٰه يَذكرونه».

الثالث والعشرون: ما رواه الحاكم والبيهقي في «شعب الإيمان» وابن حبان وأحمد وأبو يعلى وابن السُّنِّي، عن أبي سعيد الخدري رضي اللّٰه عنه، قال: قال رسول اللّٰه صلّى عليه وعلى آله وسلم: «أكثِرُوا ذِكرَ اللّٰه حتى يقولوا: إنه مجنون»[3].

---

(١) في «الترغيب» ٣: ٢١٤.

(٢) في «الترغيب» ٣: ٢١٤. وحسَّنه الهيثمي ١٠: ٧٧.

(٣) هو في «المسند» ٣: ٦٨ و ٧١. و«المستدرك» للحاكم ١: ٤٩٩، وقال «هذه صَحِيفَةٌ للمصريين صحيحةُ الإسناد، وأبو الهيثم سليمان العِتْوَاري من ثقات أهل مصر». انتهى. ولم يتكلم عليه الذهبي بشيء. وقال الهيثمي ١٠: ٧٥ «رواه أحمد وأبو يعلى، وفيه درَّاج، وقد وثقه جماعة، وضعَّفه غيرُ واحد، وبقية رجال إسنادَيْ أحمد ثقات».

الرابع والعشرون: ما رواه الطبراني عن ابن عباس رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم: «اذكُرُوا اللّه ذِكراً حتى يقولَ المنافقون إنكم تُرَاؤن»[١].

قال السيوطي في «نتيجة الفِكر في الجهر بالذكر»: وَجْهُ الاستدلال بهذين الحديثين أنه إنما يقال ذلك عند الجهرِ لا عند السِّرِّ. انتهى.

الخامس والعشرون: ما رواه البيهقي في «شعب الإيمان»[٢] مرسَلاً مرفوعاً: «أكثِرُوا ذكرَ الله حتى يقول المنافقون: إنكم مُراؤن».

السادس والعشرون: ما رواه بَقِيُّ بن مَخْلَد عن عبدالله بن عمر مرفوعاً: أن رسول الله صلّى الله عليه وسلم مَرَّ على مجلسين: أحدهما: كانوا يَدْعُون اللّه، ويَرغبون إليه، والآخَرُ: يَتْلُون العِلمَ، فقال صلّى الله عليه وسلم: كِلاَ المجلسين خير، وأحدُهما أفضل من الآخر.

السابع والعشرون: ما رواه ابن المبارك وسعيد بن منصور وابن أبي شيبة وأحمد في «الزهد»، وابن أبي حاتم، وأبو الشيخ في «كتاب العظمة»، والطبراني في «الكبير»[٣]، والبيهقي في «شعب الإيمان» عن ابن مسعود موقوفاً: «أن الجَبَل يُنادِي الجَبَلَ باسمه:

---

(١) قال الهيثمي ١٠ : ٧٦ «رواه الطبراني، وفيه الحسن بن أبي جعفر الجَفْري، وهو ضعيف».

(٢) عن أبي الجوزاء، كما في «نتيجة الفكر» للسيوطي ٢ : ٢٥ من «الحاوي للفتاوي». وهو تابعي اسمه (أَوْس بن عبدالله الرَّبَعي)، بصري، ثقة، يرسل كثيراً، مات سنة ٨٣.

(٣) قال الهيثمي ١٠ : ٧٩ «رواه الطبراني ورجاله رجال الصحيح».

يا فلان، هل مَرَّ بك اليوم مَنْ ذَكَرَ اللّه؟ فإذا قال: نعم، استبشر، ثم قرأ عبداللّه: ﴿لقد جئتم شيئاً إدّاً، تَكادُ السموات يَتفَطَّرن منه﴾ الآية[١].

الثامن والعشرون: ما رواه أبو الشيخ في «العظمة» عن محمد بن المُنْكَدِر قال: «بَلَغني أن الجبلين إذا أصْبَحا نادَى أحدُهما صاحبَه باسمه، فيقول: أيْ فلان، هل مَرَّ بك اليوم ذاكِرُ اللّهَ تعالى؟ فيقول: نعم، فيقول: لقد أقَرَّ اللّه عينيك به، ما مَرَّ بي ذاكرُ اليومَ».

التاسع والعشرون: ما رُوِيَ عن ابن عباس أنه قال في قوله تعالى: ﴿فما بَكَتْ عليهم السَّماءُ والأرضُ﴾[٢]: إنَّ المؤمن إذا مات بَكَى عليه من الأرضِ الموضعُ الذي كان يُصلِّي فيه، ويَذكُرُ اللّه. أخرجه ابن جرير في تفسيره.

الثلاثون: ما رواه ابن أبي الدنيا عن أبي عُبَيد صاحب سليمان بن عبدالملك قال: «إنَّ العبد المؤمن إذا مات تنادَتْ بقاعُ الأرضِ: عبدُاللّه المؤمنُ مات، فيَبكي عليه الأرضُ والسماء، فيقول الرحمن: ما يُبكيكما؟ فيقولان: رَبَّنا لم يَمشِ في ناحيةٍ منا قط إلا وهو يذكرك».

قال السيوطي: وَجْهُ دلالة ذلك أنَّ بكاء الأرض والجبال للذكر لا يكون إلا عند الجهر. انتهى.

الحادي والثلاثون: ما رواه البيهقي عن زيد بن أسلَم عن بعض الصحابة قال: انطلَقْتُ مع رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلم ليلةً، فمَرَّ

(١) من سورة مريم، الآية ٨٩، ٩٠.

(٢) من سورة الدخان، الآية ٢٩.

برجل في المسجد يرفع صوته، فقلت: يا رسول اللّه، عسى أن يكون هذا مُرائياً فقال: لا ولكنه أوّاهٌ».

الثاني والثلاثون: ما رواه البيهقي عن عُقبة أن رسول اللّه قال لرجل يقال له ذو البِجَادَيْن: «إنه أوّاه». وذلك أنه كان يذكر اللّه[١].

الثالث والثلاثون: ما رواه البيهقي عن جابر أنَّ رجلاً كان يَرفعُ صوته بالذكر، فقال رجل: «لو أنَّ هذا خَفَضَ من صَوْته، فقال رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلم: اتركه فإنه أوّاه».

الرابع والثلاثون: ما رواه الحاكم عن شَدَّاد بن أوس رضي اللّه تعالى عنه قال: كنا عند رسول اللّه، وقال: ارْفَعُوا أيديَكم فقولوا: لا إله إلا اللّه، ففعلنا، فقال رسول اللّه: اللّهم إنك بعثتني بهذه الكَلِم، وأمَرْتَني بها، ووَعَدْتَني عليها، إنك لا تُخلِفُ الميعاد»[٢].

الخامس والثلاثون: ما رواه ابن جرير والطبراني عن عبدالرحمن بن سَهْل قال: نَزَلتْ على رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلم ﴿واصْبِرْ نفسَك مع الذين يَدْعُون رَبَّهم﴾ الآية[٣]، وهو في بعض أبياته، فخرج فوجد قوماً يذكرون اللّه، فجَلَس معهم وقال: الحمدُ للّه الذي جَعَل أمري أن أصبِرَ مَعَهم».

---

(١) تقدم ذكرُ حديثه وتخريجُه تعليقاً في ص ٢٥.

(٢) الحاكم في «المستدرك» ١: ٥٠١ في كتاب الدعاء، وقال الذهبي: راشد ضعَّفه الدارقطني وغيره، ووثقه دُحَيم. وقال الهيثمي: ١٠: ٨١ (رواه أحمد وفيه راشد بن داود وقد وثقه غير واحد وفيه ضعف وبقية رجاله ثقات).

(٣) من سورة الكهف، الآية ٢٨.

السادس والثلاثون: ما رواه أحمد بن حنبل في «الزهد» عن ثابت قال: كان سلمانُ رضي اللّه عنه في عصابة يذكرون اللّه، فمرَّ بهم رسولُ اللّه فكَفُّوا، فقال: إني رأيتُ الرحمة تنزِلُ عليكم، فأحببت أن أشارككم فيها».

السابع والثلاثون: ما رواه الأصبهاني في كتاب «الترغيب والترهيب» عن أبي رَزِين العُقَيلي أن رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلم قال: «ألا أدلكَ على مِلاكِ الأمر؟ قال: بلى، قال: عليك مَجالِسَ الذكر، وإذا خَلَوْتَ فحرِّك لسانَك بذكر اللّه».

الثامن والثلاثون: ما رواه البيهقي والأصبهاني عن أنس مرفوعاً: «لأنْ أجلِسَ مع قوم يَذكرون اللّه بعد صلاةِ الصبح إلى أن تَطلُعَ الشمسُ، أحبُّ إلي مما طَلعَتْ عليه الشمسُ، ولأن أجلِسَ مع قومٍ يَذكُرون بعدَ العصرِ إلى أن تغيبَ الشمسُ أحبُّ إليَّ من الدنيا وما فيها».

التاسع والثلاثون: ما رواه أبو داود وأبو يَعْلَى عن أنس مرفوعاً: «لأنْ أقعُدَ مع قومٍ يَذكُرون اللّه حتى مَطْلَعِ الشمس أحبُّ إليَّ من أن أُعتِقَ أربعةً من وَلَدِ إسماعيل، ولأن أَقعُدَ مع قوم يذكرون اللّه من صلاةِ العصر ــ إلى أن تغرب الشمس ــ أحبُّ إليَّ من أن أُعتق أربعة»[١].

الأربعون: ما رواه البخاري ومسلم بسندهما عن عَمْرو بن دينار قال: أخبرني أبو مَعْبَد أصدَقُ مَوَالي ابن عباس، عن مولاه ابنِ عباس، قال «إنَّ رَفْعَ الصوتِ بالذكر حين يَنصرِفُ الناسِ من المكتوبة كان على عهدِ رسول اللّه صلى اللّه عليه وسلم».

---

(١) أبو داود ٤ :٧٣ في كتاب العلم (باب في القصص) بسند حسن.

وفي رواية لهما بسندهما المذكور عنه قال: «كنتُ أعرِفُ انقضاءَ صلاةَ رسولِ اللّه بالتكبير»[1].

لا يقال: قد جاء في سَنَد مسلم أنَّ عمرو بن دينار قال: أخبرني بهذا أبو مَعْبَد ثم أنكره بَعْدُ، والأصلُ إذا أنكرَ الروايةَ، أو كذَّبَ الفرعَ يَسقُطُ الاعتبارُ بتلك الرواية!

لأنا نقول: هذه مسألةٌ معروفة عن المحدِّثين، وفيها تفصيل، وهو أنَّ الأصلَ إمَّا إن يَجزِمَ بالتكذيب أو لا يَجزم، وإذا جَزَم فتارةً يُصرِّح، وتارة لا يُصرِّح، فإن لم يَجزم بتكذيبه كأن قال: لا أذكرُه، فاتفقوا على قبولِه، وإن جَزَم وصرَّح بتكذيبه، فاتفقوا على رَدِّه، وإن جَزَم ولم يُصرِّح به كقول أبي مَعْبَد في هذه الرواية: لم أُحدِّثك بهذا، ففيه اختلاف.

فذَهَب ابنُ الصلاح تَبَعاً للخطيب إلى رَدِّه، حيث قال في «مقدمة أصول الحديث»[2]: إذا رَوَى ثقةٌ عن ثقةٍ حديثاً، ورَجَع المرويُّ عنه، فالمختارُ أنه إن كان جازماً بنَفْيِهِ بأن قال: ما رَوَيتُه، أو كذبتَ عليَّ، أو نحوَ ذلك، وقد تعارَضَ الجزمانِ، والجهلُ هو الأصل، فوجَبَ رَدُّ حديثِ فَرْعِه، ثم لا يكون ذلك جَرْحاً له أيضاً، فإنه مكذِّبٌ لشيخِهِ أيضاً فتعارَضَا.

أما إذا قال المرويُّ عنه: لا أعرِفُه، أو لا أذكُرُه، ونحوَ ذلك، فذلك لا يكون مُسقِطاً عند جمهور أهل الحديث والفقهاءِ والمتكلمين،

---

(١) البخاري ٢: ٣٢٤ في كتاب الأذان (باب الذكر بعد الصلاة)، ومسلم ٥: ٨٣، في كتاب المساجد ومواضع الصلاة (باب الذكر بعد الصلاة).

(٢) ص ١٠٥ في النوع ٢٣.

خِلافاً لقومٍ من أصحابِ أبـي حنيفة، فإنهم ذَهَبوا إلى إسقاطه، وبَنَوْا عليه رَدَّهم حديثَ سليمان بن موسى، عن الزهري، عن عروة، عن عائشة، عن رسول الله صلّى الله عليه وسلم: «إذا نَكَحَتْ المرأةُ بغير إذنِ وَلِيِّها فنِكاحُها باطل»، من أجل أنَّ ابن جُرَيج قال: لقيتُ الزهري فسألتُه عنه فلم يَعرفه، والصحيحُ ما عليه الجمهور. انتهى كلامه.

فسوَّى ابنُ الصلاح بين ما إذا صَرَّح بتكذيبه وقال: كذبتَ عليَّ، أولم يُصرِّح به، بأن قال: ما رَوَيتُه، وهو الذي مَشَى عليه الحافظ ابن حجر في «شرح النخبة»، لكن قال في «فتح الباري»[1]: إنَّ الراجح عند المحدِّثين القبول، وتمسَّك بصَنيعِ مسلم، حيث أخرج حديثَ عَمْرِو بن دينار المذكورَ مع قول أبـي مَعْبَدٍ له: لم أُحدِّثك، فإنه دَلَّ على أنَّ مُسْلِماً كان يَرى صحةَ الحديثِ الذي يُروَى على هذا الوجه، مع إنكار المحدِّث له إذا حَدَّثَ به ثقة.

وهو مذهبُ جمهور العلماء من المحدِّثين والفقهاء والأصوليين، فقالوا: يُحتَجُّ به إذا كان إنكارُ الشيخ له لتشكيكه، أو نسيانِهِ، أو قال: لا أحفَظُه، وخالَفَهم الكَرْخيُّ من أصحاب أبـي حنيفة فقال: لا يُحتَجُّ به. انتهى.

فظَهَر أنه لا قَدْحَ في اعتبار هذا الحديث، كيف وقد أخرجه الشيخان في «صحيحهما»، وكَفَاك به عِبرة.

فإن قلتَ: هذا الحديثُ وإن كان يُثْبِتُ الجهرَ بالذكر، إلا أنه غيرُ معمول به عند جمهور الفقهاءِ: الحنفيةِ والشافعية، فإنهم صَرَّحوا بأنه

---

(١) ٢: ٣٢٦.

لا يُسنُّ الجهرُ بالذكر بعدَ الصلاة، بل بالسِّرِّ، قال في «نِصاب الاحتساب»: إذا كبَّروا على إثْرِ الصلاة جهراً يُكرَهُ، وإنه بِدْعَة، يَعني سِوَى النَّحْرِ وأيامِ التشريق. انتهى.

وقال النووي في «شرح صحيح مسلم»[1]: هذا الحديث دليلٌ لما قاله بعضُ السلف: إنه يُستحبُّ رفعُ الصوت بالذكر عقيبَ المكتوبة، وممن استحبَّه ابنُ حزم الظاهري.

ونَقَل ابنُ بطال وغيرُه أنَّ أربابَ المذاهبِ متفقون على عدم استحباب رفع الصوت بالذكر، وحَمَل الشافعي هذا الحديثَ على أنه جَهر وقتاً يسيراً، لا أنهم جَهَروا دائماً. انتهى.

قلتُ: عَدَمُ كونِهِ معمولاً به في استحباب الجهر بالذكر بعد الصلاة، لا يَستلزمُ عدم جوازه مطلقاً، فإنَّ الحديث دَلَّ على مطلقِ الجواز ولو أحياناً، وليس المطلوبُ إلا هذا.

الحادي والأربعون: ما رواه الحاكم عن عمر مرفوعاً: «من دَخَل السوقَ فقال: لا إله إلا اللَّه وَحْدَهُ لا شريكَ له، له المُلكُ، وله الحمد، يُحيي ويُميت، ـ بيده الخير ـ وهو على كل شيء قدير، كتب اللَّه له ألفَ ألفِ حسنة»، وفي بعض الطُّرق: فنَادَى[2].

---

(١) ٥: ٨٤.

(٢) الحاكم في «المستدرك» ١: ٥٣٨ في كتاب الدعاء. وسقط من الأصل لفظ (بيده الخير)، وليس في رواية الحاكم من النسخة المطبوعة لفظُ (فنادَى). وللحديث تتمة عند الحاكم وهي «ومَحَا عنه ألفَ ألفِ سيئة، وبَنَى له بيتاً في الجنة». قال الحاكم: «هكذا رواه عبدالله بن وهب، ورواه إسماعيل بن عياش عن عمر بن محمد بن زيد بن سالم». قال الذهبي: «في سنده أزهر بن سنان القرشي، قال ابن عدي: أرجو أنه لا بأس به».

الثاني والأربعون: ما رواه سعيد بن منصور، من رواية عُبَيد بن عمير، عن عمر رضي الله عنه، وأبو عُبَيد من وجهٍ آخر عنه، والبيهقي أيضاً عنه، وعلَّقه البخاريُّ[١]: أنه كان يُكَبِّرُ في قُبَّةٍ بمِنىً، فيَسمَعُه أهلُ المسجد فيُكبرون، ويُكبِّر أهلُ الأسواق حتى تَرْتَجَّ مِنىً تكبيراً.

فهذه أحاديثُ صحيحةٌ يَظهر منها ومن نظائرها صَرَاحةً أو إشارة: أنْ لا كراهةَ في الجهر بالذكر، بل فيها ما يدلُّ على جوازِهِ، أو استحبابِهِ، كيف لا والجهرُ بالذكر له أثرٌ في ترقيقِ القلوب، ما ليس في السر.

نعم الجهرُ المُفْرِطُ ممنوع شرعاً، وكذا الجهرُ الغيرُ المفرط إذا كان فيه إيذاءٌ لأحدٍ من نائم أو مُصَلٍّ، أو حَصَلَتْ فيه شُبهةُ رياء، أو لُوحِظَتْ فيه خُصوصيَّاتٌ غيرُ مشروعة، أو التُزِمَ كالتزامِ المُلْتَزَمات، فكم من مباحٍ يَصِيرُ بالالتزام ـ من غير لزوم ـ، والتخصيصِ ـ من غير مخصص ـ: مكروهاً، كما صَرَّح به علي القاري في «شرح المِشكاة»، والحَصْكَفِيُّ في «الدر المختار» وغيرُهما ـ.

ولا تَظُنَّنَ أنَّ الحكم بجواز الجهر بالذكر مخالِفٌ لإجماع الحنفية، فإن دعوى إجماعِهم على المنعِ باطل، فقد جَوَّزه البَزَّازِي في «فتاواه» كما نقلنا كلامَه[٢].

وما قال السيدُ الحَمَوِيّ في «حواشي الأشباه» من أنَّ كلام البَزَّازِي في «فتاواه» مضطرِبٌ، فتارةً قال: إنه حرام، وتارةً قال: جائز، ليس بصحيح، لأنَّ البزازي إنما مالَ إلى الجواز، وأما حُرمتُه فإنما ذَكرها على

---

(١) في ٢: ٤٦١ في كتاب العيدين (باب التكبير أيام منى).

(٢) فيما تقدم في ص ٢٦ ـ ٢٨.

سبيل النقل من فتاوى القاضي، فلا اضطرابَ في كلامه.

ومن مُجوِّزِيه خيرُ المتأخرين العلامةُ خيرُالدين الرَّمْلي[١] في «فتاواه» كما مَرَّ ذكره[٢].

ومنهم الشيخُ عبدالحق الدِّهْلَوِي، حيث أورد في رسالته المسمَّاة «بتوصيل المُرِيد إلى المُراد، ببيانِ أحكام الأحزابِ والأوراد» كلاماً طويلاً بالفارسية في جوازه، وأنا أذكرُهُ مُعَرَّباً فنقول:

الجهرُ والإعلانُ بالذكرِ والتلاوةِ، والاجتماعُ للذكر في المجالسِ والمساجدِ جائزٌ ومشروع، لحديث «من ذَكَرني في مَلأٍ ذكرتُهُ في مَلأٍ خيرٍ منه». وقولُهُ تعالى: ﴿كذِكْرِكُمْ آباءَكم أَوْ أَشَدَّ ذِكْراً﴾[٣] أيضاً يمكن دليلاً له، وفي «صحيح البخاري» عن ابن عباس أنه قال: «كُنَّا لا نَعرِفُ انصرافَ الناس من الصلاة في عهد رسول الله إلا بالذِكرِ جهراً»[٤].

وفي «الصحيح» أنهم كانوا يَجهرون بلا إلهَ إلا اللَّه وحدَهُ لا شريك له، له المُلْكُ، وله الحمدُ، وهو على كل شيء قدير». وجاء في بعضِ الرواياتِ تخصيصُهُ بالفجرِ والمغرب[٥].

---

(١) أستاذُ صاحب «الدر المختار». منه ـ أي من المؤلف ـ رحمةُ اللَّه تعالى عليه.

(٢) في ص ٢٨.

(٣) من سورة البقرة، الآية ٢٠٠.

(٤) تقدم ذكره بنحو هذا اللفظ في ص ٥٨.

(٥) الذي وقفت عليه في «صحيح البخاري» ٢ :٣٢٥ في كتاب الأذان (باب الذكر بعد الصلاة)، و١١ :١٣٣ في كتاب الدعوات باب الدعاء بعد الصلاة)، وفي «صحيح مسلم» ٥ :٩٠ (باب الذكر بعد الصلاة) واللفظ لمسلم: «كتب معاوية إلى المغيرة بن شعبة: اكتُبْ لي بشيء سمعتَه من رسول اللَّه ﷺ، فكتب إليه: سمعت رسول اللَّه ﷺ يقول إذا قَضى الصلاة: لا إلَه إلا اللَّه وَحْدَهُ..

وسياقُ قوله عليه الصلاة والسلام: «يا أيُّها الناسُ، ارْبَعُوا على أنفسكم، فإنكم لا تَدْعُون أصَمَّ ولا غائباً» يَدُلُّ على أنَّ المنع لم يكن لعدمِ شرعية الجهر، بل لطلبِ التأني والتيسير.

وقد ثَبَتَ جَهْرُهُ صلّى اللّٰه عليه وعلى آله وسلم بالأذكارِ والأدعيةِ في كثير من المواضعِ، وعَمِلَ به السلفُ، وفي «صحيح البخاري»[١]: «لما كانت الصحابةُ مشتغلين بحفر الخَنْدَقِ مَحْمُومِين[٢] بهم الجُوْعُ، رأى رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وعلى آله وسلم حالَهم، وكان يقول: اللهمَّ لا عيشَ إلا عيشُ الآخِرة، فاغفِر للأنصارِ والمهاجرة، وكانوا يقولون في جوابه:

نحن الذين بايَعُوا محمداً على الجهادِ ما بقينا أبداً

وبالجملة: لا كلامَ في وقوع الجهر في المَحَالِّ المخصوصةِ، والمواضعِ المُعَيَّنة، إنما الكلامُ في أنَّ ثبوتَ حكمٍ في قضيةٍ هل يُمكِنُ دليلاً على ثبوته عموماً، أمْ لا؟ فيجوزُ للمخالِف أن يقول: لعل في تلك المواضع تكون فائدةٌ مخصوصةٌ لا تُوجَدُ في غيرها، أو يقول: لعل الجمعَ بين الذكر والدعاء جهراً جائز، ولا يجوزُ الجهرُ بالذكرِ أو الدعاءِ انفراداً، فوَجَبَ ذكرُ الدلائل التي تَدُلُّ على عموم الجواز.

فأما الاجتماعُ للذكرِ بانفرادٍ فهو ثابتٌ من حديث متفقٍ عليه، من رواية أبي هريرة مرفوعاً: «إنَّ للّٰه ملائكةً يطوفون في الطرق، يَلْتَمِسُون

---

(١) في ٦: ٤٥ في كتاب الجهاد (باب الصبر عند القتال) وهو بمعناه، من حديث أنس.

(٢) هكذا في الأصل. ولم أجدها في الحديث. ولعلها: (مهمومين).

حِلَقَ الذكر» الحديث[١]، وفي رواية أخرى: «وما جَلَس قومٌ مسلمون مجلساً يذكرون اللّهَ فيه إلا حَفَّتْ بهم الملائكة، ونَزَلَتْ عليهم السكينةُ، وغَشِيَتْهُم الرحمة»[٢].

وتأويلُ الذكر بمذاكرةِ العلم وآلاءِ اللّه تعالى بعيدٌ، ولا يجوزُ حملُ لفظ على خلافِ المتبادِرِ إلى الذهن من غير ضرورة.

ولا يقال: لا يَلزمُ من اجتماع قومٍ للذكر جَهْرُهم بالذكر، لجوازِ أن يكون ذكرُ كلٍّ منهم سِراً على حِدَة.

لأنا نقول: إذا كان الذكر سراً، فلا يَظهَرُ للاجتماع فائدةٌ مُعْتَدٌّ بها، وأما جوازُ الاجتماع للدعاءِ فهو ثابتٌ من حديث رواه الحاكم وقال: على شَرْطِ مسلم مرفوعاً: «لا يَجتمعُ ملأ، فيدعو بعضُهم، ويُؤَمِّنُ بعضُهم إلا استجاب اللّهُ دُعاءَهم»[٣].

وأما الاجتماعُ للتلاوة فهو ثابت من حديث «ما اجتَمَعَ قومٌ في بيتٍ من بيوتِ اللّه، يقرؤن القرآن، ويتدارَسُونه، إلا حَفَّتْ بهم الملائكة» صَحَّحه النووي وغيره[٤]، ومن ها هنا أخذوا جوازَ قراءةِ الأحزاب والأوراد في المساجد والمجالس.

---

(١) تقدم ذكره في ص ٤٦ ـ ٤٧.

(٢) رواها مسلم في «صحيحه» ١٧ : ٢١. ولفظ (مسلمون) هنا مقحم على الحديث، ولعله زاده الدهلوي في الترجمة إلى الفارسية، فتابَعه المؤلف في ترجمته إلى العربية.

(٣) ساقه الحاكم في «المستدرك» ٣ : ٣٤٧. وسكت عنه، وسنده حسن.

(٤) هو في «صحيح مسلم» ١٧ : ٢١ في كتاب الذكر والدعاء (باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر). فقولُ الشيخ عبدالحق الدهلوي: «صَحَّحه النووي وغيره» فيه تساهل.

وذهَبَ مالك وأصحابه إلى كراهة جميع هذهِ الأمور لعدم عمل السلف بها، ولسدِّ الذرائع، وقطعِ مَوَادِّ البِدْعَة، لئلا تَلزَمَ الزيادةُ في الدين، والخروجُ عن الحق المبين، وقد وقع في زماننا هذا ما خافَهُ واتقاه. انتهى كلامُهُ بتعريبه.

وقال الشيخ الدِّهْلَوِي أيضاً في «شرح المِشكاة» في شرح حديث أُبَيِّ بن كعب: «كان رسول اللَّه صلّى اللَّه عليه وعلى آله وسلم إذا سَلَّم من الوتر قال: سبحانَ المَلِك القُدُّوس، ثلاث مرات، ويَرفَعُ صوته بالثالثة» الذي رواه أبو داود والنسائي وابن أبي شيبة وأحمد والدارقطني وغيرُهم[1]، **وهو الثالث والأربعون من أدلة جواز الجهر.**

في هذا الحديث دليلٌ على شرعيةِ الجهر بالذكر، وهو ثابت في الشرع بلا شبهة، لكنَّ الخفيَّ منه أفضل. انتهى.

وفي «المِرقاة» لعلي القاري رحمه اللَّه تعالى عند شرح هذا الحديث ناقلاً عن المُظْهِر[2]: هذا يَدُلُّ على جواز الذكر برفع الصوت، بل على الاستحباب، إذا اجتُنِبَ الرياء إظهاراً للدين، وتعليماً للسَّامِعين، وإيقاظاً لهم من الغَفْلَة، وإيصالاً لبركةِ الذكر إلى مِقدار ما يَبلُغ الصوتُ إليه من الحيوانِ والشجرِ والمَدَر، وطَلَباً لاقتداء الغَيْر بالخير، ولِيَشْهَدَ له كلُّ رَطْبٍ ويابس. وبعضُ المشايخ يختارون إخفاءَ الذكر، لأنه أبعَدُ من الرياء، وهذا متعلِّقٌ بالنية. انتهى.

---

(١) أبو داود ٢: ١٣٧ في كتاب الصلاة (باب في الدعاء بعد الوتر) ولفظه (كان رسول اللَّه إذا سلم في الوتر قال: سبحان الملك القدوس)، والنسائي ٣: ٢٣٥ في كتاب قيام الليل (باب كيف الوتر بثلاث) و ٢٤٩ (باب التسبيح بعد الفراغ من الوتر)، والإمام أحمد في «المسند» ٥: ١٢٣.

(٢) أي الشارح.

ولا يَخفى أنَّ سكوتَ علي القاري عن الردّ على المُظْهِر، وتقريرَهُ عليه ـ مع كونِ دَأْبِهِ في جميع تصانيفه الردَّ على خِلافِهِ ـ يَدُلُّ على أنه أيضـاً من مُجوِّزيـه، وإليه يَمِيـلُ بعضُ عباراتـه في «شرح الحِصن الحصين»، وإن كان بعضُ عباراته في موضع آخر من ذلك يأبـى عنه.

ومن أدلَّةِ جوازه أيضاً، **وهو الرابعُ والأربعون**: ما ذكره أصحاب السِّيَر كصاحب «السِّيرة الشامية»، و «المَوَاهب اللَّدُنِّيَّة»، وغيرِهما من رواية ابن سعد في قِصَّةِ قَتْلِ محمدِ بن مَسْلَمة وأصحـابِهِ: كَعْبَ بنَ الأشرف، من أنهم لما قتلوه ورجعوا، وبَلَغوا بَقِيعَ الغَرْقَد، كَبَّروا جهراً، وقد كان رسول اللَّه صلّى اللَّه عليه وعلى آله وسلم قائماً يُصلِّي في تلك الليلة، فلما سَمِعَ تكبيرَهم كبَّر وعَرَف أنهم قد قَتَلوه. القصة[1].

الخامسُ والأربعون: ما رواه أبو نعيم في «حِلية الأولياء» عن ابن جابر قال: كان أبو مسلم الخَوْلَاني يُكثِرُ أن يَرفع صوتَه بالتكبير حتى مع الصبيان، ويقول: اذكُروا اللَّه حتى يرى الجاهلُ أنكم من المجانين.

السادس والأربعون: ما رواه أبو نعيم أيضاً عن أبي يونس أن أبا هريرة صلَّى يوماً بالناس، فلما سَلَّم رَفَع صوتَه وقال: الحمدُ للَّه الذي جَعَل الدين قِواماً، وجَعَل أبا هريرة إماماً، بعد أن كان أَجِيراً.

السابع والأربعون: ما رواه أيضاً عن مُضَارِب قال: بينا أنا أسِيرُ من الليل إذا رجلٌ يُكبِّرُ، فأَلحَقْتُهُ بَعيري، فقلتُ: من هذا المكبِّر؟ فقال أبو هِرّ، فقلتُ: ما هذا التكبيرُ؟ فقال: شُكْر.

الثامن والأربعون: مـا رواه البـزَّار والـطبـراني وأبـو نعيم في

---

(١) في طبقات ابن سعد ٢ : ٣١ (سرية قتل كعب بن الأشرف).

«الحلية»، والبيهقي في الدلائل»، وأبو نعيم في «الدلائل»، وابن عساكر في قِصةِ إسلام عمر بن الخطاب رضي الله عنه، أنه لما جاء عند رسول الله صَلّى الله عليه وعلى آله وسلم، وكان مع أصحابه في دار الأرقم، وقال: أشهَدُ أنْ لا إلَهَ إلا الله، وأنك رسولُ الله، كبَّر أهلُ الدارِ تكبيرة سَمِعَها أهلُ المسجد[١].

وخلاصةُ المَرام، في هذا المقام: أنه لا ريبَ في كونِ السرِّ أفضلَ من الجهرِ للتضرُّع والخِيْفَة، وكذا لا ريبَ في كونِ الجهرِ المُفْرِطِ ممنوعاً لحديث: «ارْبَعُوا على أنفُسِكم».

وأما الجهرُ الغَيْرُ المُفْرط فالأحاديثُ متظاهرة، والآثارُ متوافِقَةٌ على جوازه، ولم نجد دليلاً يَدلُّ صراحةً على حُرمةٍ أو كراهةٍ. وقد نَصَّ المحدِّثون والفقهاءُ الشافعيةُ وبعضُ أصحابنا على جوازِه أيضاً، ويدلُّ عليه قولُ صاحب «النهاية» في كتاب الحج: «المُسْتحَبُّ عندنا في الأذكار الخُفْيَةُ إلا فيما تعلَّق بإعلانِهِ مقصود كالأذانِ والتلبيةِ والخُطبة، كذا في «المبسوط». انتهى.

والظاهرُ أنَّ مراد من قال: الجَهْرُ حرام، هُوَ الجَهْرُ المُفْرِط بدليلِ أنهم يَستدلُّون عليه بقولِهِ عليه الصلاة والسلام: «ارْبَعُوا على أنْفُسِكم» الحديث، وقد عرفتَ في شأنِ ورودِهِ أنَّ وروده إنما كان في الجهر المُفرط، لا في الجهرِ مطلقاً، مع أنه كيف تَثبُتُ الحرمةُ الحقيقية بخبر الآحاد الذي هو من الأدلةِ الظنية.

---

(١) قال الهيثمي في «مجمع الزوائد» ٩: ٦٤ «رواه البزار وفيه أسامة بن زيد بن أسلم، وهو ضعيف». وفي الحاشية: (فيه من هو أضعف من أسامة وهو إسحاق بن إبراهيم الحُنَيْني، وقد ذكر البزار أنه تفرد به. ابن حجر).

ومن قال: إنه بدعةٌ أراد به أنَّ إيقاعَه على وجهٍ مخصوص، والتزامٍ مُلْتَزَمٍ لم يُعْهَد في الشرع، بدليلِ أنهم إنما أطلقوا البدعةَ عليه في بحث التكبير في طريق صلاة عيدِ الفطر، وقالوا: الجهرُ به في الطريق على الوجه المخصوص إنما وَرَد في عيد الأضحى، وأمَّا في عيد الفطر فهو بدعة، فتأمَّل في هذا المقام، ليظهر لك أصلُ المَرام، فكم زَلَّتْ فيه الأقدام، وتحيَّرتْ فيه الأقوام، ولا تعْجَلْ في الردِّ والقبولِ فإنه من وظائفِ العوام.

تتمة: ها هنا ذِكرٌ آخَرُ غيرُ السِّرِّ والجهر، وهو الذكرُ القَلْبِـيُّ، وقد أنكره بعضُ الفقهاء، وقالوا: هو ليس بشيء.

والحقُّ أنه مُكابرة، فإنَّ الذكرَ ضِدُّ النسيان، وهما في الأصل من أفعالِ القلب لا اللسان، نعم للذكر اللِّساني آثارٌ مخصوصة، وأحكامٌ معلومة، ليست للذكر القلبي، ولا يَلزَمُ منه نفيُ إطلاقِ الذكر على فِعلِ القلب، كذا ذكره الشيخ الدِّهْلَوي في رسالتِهِ المسمَّاة بـ«تنبيه أهل الذِكر، برعايةِ آدابِ الذِكر».

وفي «الحِرز الثمين شرح الحِصن الحصين» في شرح «مَنْ ذَكَرني في نفسِهِ ذكرتُه في نفسي»، الحديث. فيه دليلٌ على أنَّ الذكر القلبي أفضلُ ثم اللسانيُّ الإخفائيُّ، لما وَرَد أنَّ الذكرِ الخفي الذي لا يَسْمَعُه الحَفَظَةُ يُضعَّفُ سبعون ضِعفاً، ووَرَد «خيرُ الذكر الخَفِي». انتهى.

وفيه عند قولِ المصنف: وكلُّ ذكرٍ مشروعٍ واجباً كان أو مُسْتحباً لا يُعتَدُّ به حتى يُسمِعَ نَفْسَه الخ.

هذا كلُّه فيما أَمَر الشارعُ بأن يُذكَرَ باللسان، كما في قراءةِ الصلاةِ

والتشهدِ وتسبيحاتِها، وليس معناه أنَّ من يَذكُرُ اللّه تعالى بقلبِهِ من غيرِ أن يتلفَّظَ بلسانِهِ لا يكونُ في الشرع مُعْتَداً به، فإنَّ مُداوَمَةَ الذكرِ لا يُتصوَّرُ بدون اعتبارِهِ، بل هو أفضلُ أنواعِهِ.

وقد أخرج أبو يَعْلَى المَوْصِلي في «مُسْنَده» عن عائشة مرفوعاً: «أفضَلُ الذكرِ الخفي الذي لا تَسْمَعُه الحَفَظَة، يقال لهم يوم القيامة: انظُرُوا هل بقِيَ له من شيء؟ فيقولون: ما تركنا شيئاً مما عَلِمناه وحفظناه إلا وقد أحصيناه وكتبناه، فيقول اللّه تعالى: إنَّ لك عندي خَبِيْئاً لا تعلمه وأنا أَجزِيك به، وهو الذكرُ الخفي. كذا ذكره السيوطي في «البُدُور السافِرة، في أحوالِ الآخرة»[١].

وفي «الجامع» «خيرُ الذِكرِ الخفي، وخيرُ الرزقِ ما يكفِي». رواه أحمد وابنُ حِبَّان والبيهقي. انتهى.

ومن توابع الذكر القلبيِّ: الذكرُ النَّفَسِيُّ، وهو أن يَحصُلَ بصُعُودِ النَّفَسِ وهُبُوطِه ذِكرُ لا إله إلا اللّه، هُوَ أو نحوُ ذلك، وهو ذكرٌ حَسَنٌ مُوْجِبٌ لحصولِ التشبُّه بالملائكةِ، لما رواه أبو الشيخ في قوله تعالى: ﴿يُسَبِّحون الليلَ والنَّهارَ﴾[٢] عن الحَسَن قال: إنه يقول: جَعلتُ أنفاسَهم لهم تسبيحاً.

ورَوَى ابنُ المنذر وابن أبـي حاتم والبيهقي في «شُعَب الإيمان»، وأبو الشيخ، عن عبداللّه بن الحارث قال: قلتُ لكعبٍ: أرأيتَ قولَ اللّه

---

(١) قال الهيثمي في «مجمع الزوائد» ١٠: ٨١ «رواه أبو يعلى، وفيه معاوية بن يحيى الصَّدَفي، وهو ضعيف».

(٢) من سورة الأنبياء، الآية ٢٠.

تعالى ﴿لا يَفْتُرون﴾[1]، أما تَشْغَلُهم رسالة؟ أما تَشغَلُهم حاجَة؟ فقال: جَعَل لهم التسبيح كما جَعَل لكم النَّفَس، ألستَ تأكلُ وتشرِبُ وتقومُ وتجلس وتذهَبُ وتتكلَّمُ وأنت تتنفَّسُ، فكذلك جَعَل لهم التسبيحَ، فهم يُسَبحون الليلَ والنهار لا يَفْتُرون.

فهذا الحديثُ أصلٌ أصيل، ومَأخَذٌ جليل للذكرِ النَّفَسِي، فاحفظه فإنه من سَوَانح الوقت.

---

(١) من سورة الأنبياء، الآية ٢٠.

الباب الثاني

في ذكر المواضع التي وَرَدَ الشرعُ بالجهر فيها

منها: الأذانُ، وقد وَرَد به الجهر، واتَّفَقَ عليه كلماتُ أهل الأَثَر، كيف والأذانُ إنما هو للإعلام، ولا يَحصُل ذلك إلا به، ومن ثَمَّ صَرَّحوا بأنه يُستَحَبُّ أن يكون المؤذِّنُ رفيعَ الصوت.

واستخرجوا ذلك مما ورد في قصة رُؤْيَةِ عبدالله بن زَيْد رضي الله عنه الأذانَ في المنام، «من أنه لما أخبرَ به رسولَ الله صلّى الله عليه وعلى آله وسلم قال له: أَلْقِهِ على بلالٍ فإنه أَنْدَى صَوْتاً منك، أي أَرْفَعُ، فقام فألقاه، فأذَّن بلال، ولم يَزَلْ مؤذِّناً في الحياة النبوية».

رواه أبو داود والترمذي وابن خُزَيمة في «صحيحه» وأحمد في «مسنده»، وزاد في آخره: «وكان بلال يُؤذِّنُ إلى أن جاء ذاتَ غَداةٍ، فَدَعَا رسولَ الله إلى صلاة الفجر، فقيل له: إنه نائم، فصَرَخَ بلال بأعلى صوته: الصلاةُ خيرٌ من النوم، فأُدخِلَتْ هذه الكلمةُ في تأذين الفجر»، وابنُ حبان في «صحيحه»، وابنُ ماجه وغيرُهم بأسانيد جيدة[١].

---

(١) أبو داود ١: ٣٣٧ في كتاب الصلاة (باب كيف الأذان)، والترمذي ١: ٣٥٨ في أبواب الصلاة (باب ما جاء في بدء الأذان)، وقال: حديث حسن صحيح، وابن ماجه ١: ٢٣٢ في كتاب الأذان (باب بدء الأذان)، والإمام أحمد ٤: ٤٣، وابن خزيمة ١: ١٩١ في جماع أبواب الأذان والإقامة.

وفي «شرح الهداية» للعيني: يُستَحَبُّ أن يَرفَعَ المؤذِّنُ صوتَه.

وجاء في حديث أبي مَحْذُورة: «ارْفَعْ من صَوْتك، ومُدَّ من صَوْتِك»[١]. وفي حديث عبدالله: «أَلْقِهِ على بلال، فإنه أندى صَوْتاً منك»، ولأنَّ المقصود منه الإعلامُ.

ولهذا كان الأفضلُ للمؤذِّن أن يكون في موضعٍ يكون أسمَعَ للجيران كالمِئذنةِ ونحوها، لحديث أبي بَرْزَةَ الأَسْلمي، قال: «مِن السُّنَّة الأذانُ على المنارةِ، والإقامةُ في المسجد» رواه أبو الشيخ، والحافظ أبو القاسم تَمَّامُ بنُ محمد الرازي. ولا ينبغي أن يُجْهِدَ نَفْسَه[٢]، لأنه يخاف منه حدوث الفَتْقِ والضعفِ في الصوت. انتهى كلامه.

وفي «جامع المُضْمَرات»: يُكرَهُ للمؤذِّنِ أن يَرفَعَ صوتَه فوقَ طاقته. انتهى.

ويَتفرَّعُ على استحبابِ رفع الصوتِ مسائل:

أحدُها: أنه يُستحب أن يَجعَل إِصْبَعَيْهِ في أُذُنَيْهِ ليكون الصوتُ أرفع.

قال في «الهداية»: الأفضلُ للمؤذِّن أن يَجعل إِصْبَعَيْه في أُذُنَيْه، وإن لم يَفْعَل فحَسَنٌ، لأنها ليسَتْ بسُنَّةٍ أصلية.

---

(١) رواه أبو داود ١: ٣٤٠ في كتاب الصلاة (باب كيف الأذان)، والترمذي ١: ٣٦٦ في أبواب الصلاة (باب ما جاء في الترجيع في الأذان)، وابن ماجه ١: ٢٣٤ في كتاب الأذان (باب الترجيع في الأذان)، والإمام أحمد ٣: ٤٠٨.

(٢) وقع في الأصل وفي «البناية في شرح الهداية» للعيني ١: ٥٤٥ المنقول عنها: (يحمل نفسه). وهو تحريف عن (يُجهِدَ)، كما جاء اللفظ على الصواب في «البحر الرائق» لابن نجيم ١: ٢٥٥.

واختَلَفَتْ جَماعَةُ شُرَّاحِها في شرحه، فقال صاحبُ «الدراية»: أي الأذانُ حَسَنٌ، لا تَرْكُ الفعلِ، لأنه أَمَر به رسولُ اللّه صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم بلالاً، فلا يَليقُ به أن يُوصَفَ تَرْكُه بالحُسْن، لكن لمَّا لم يكن من السُّنَنِ الأصلية لم يُـؤَثِّر زَوالُه في زَوالِ حُسْنِ الأذان. انتهى.

وتَبِعَه صاحبُ «العِناية»، وكذا ذكره السَّرُوْجيُّ في «الغَاية»، وقال تاجُ الشريعة: إنما كان كذلك لأنه ليس من السُّنَنِ الأصليةِ المشهورة في الأذان، وهو غيرُ مذكور في حديثِ الرُّؤيَا، وهو السَّبَبُ في شرعِ الأذان. انتهى.

وقال صاحبُ «النهاية»: إسنادُ الحُسْنِ إلى الأذان مذكـورٌ في «الفوائد الظهيرية».

قال الشيخ: ونظيرُهُ قولَه صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم لعمَّار رضي اللّه عنه: «إنْ عادُوا فَعُدْ» أي: إن عادوا إلى الإكراهِ فعُدْ إلى تخليصِ نفسك. انتهى[1].

---

(١) يريد بهذا الكلام توجيهَ قول صاحب «الهداية» فيها: «والأفضلُ للمؤذِّن أن يَجعل إصبعيه في أذنيه، فإن لم يَفعل فحسَنٌ». أي كيف يكون تركُ الأفضلِ والسنةِ حَسَناً؟ أجاب عنه الشّيخ بأنه نظير قوله ﷺ لعمَّار بن ياسر، حين عذَّبه المشركون حتى يكفر بمحمد ﷺ، فوافقهم على ذلك مكرهاً، ثم جاء فشكا ذلك، إلى النبي ﷺ.

فقال: «كيف تجد قلبك» قال: مطمئناً بالإيمان، فقال النبي ﷺ: «إن عادوا فعُدْ». فليس قوله له (فعُدْ) أمراً واستحساناً لفعله الذي ترخَّص به، ولكن يعني به: جَوازَ ذلك إذا وقع مرة ثانية، وكذلك صاحب «الهداية» يقصدُ بقوله: «فإن لم يفعل فحَسنٌ» الجوازَ، لا أنه فِعلٌ حسنٌ محمود مفضَّل على الأفضل، وهو جعل إصبعيه في أذنيه.

وهذا الخبر في شأن سيدنا عمَّار بن ياسر، رواه الحافظ ابن كثير في=

وقال صاحبُ «غايةِ البيان»: يجوز أن يقال الأفضلُ جَعْلُ الإصْبَعَيْن في الأُذُنين، وذلك يقتضِي الفاضلَ، فإذا كان فعلُهُ أفضَلَ يكون تركُهُ فاضلاً حَسَناً. انتهى.

هذا كلامُ الشراح، ثم جاء العيني بعدَهم فردَّهم بأجمعهم حيث قال[1]: الكلُّ خَرَجُوا من الدائرة، فإنَّ التركيب وإن كان غريباً لكنه لا يَقبلُ هذه التأويلات، بيانُه أنَّ قوله: لم يَفْعَل، فيه ضميرٌ مرفوع راجعٌ إلى المؤذِّن، والمفعولُ محذوف.

وقولُه: فحسَنٌ، جوابُ الشرط، والمعنى عدَمُ فعلِهِ حَسَن، وقولُ من قال: إنه ليس من السُّنَن الأصلية ليس بمُوَجَّهٍ، لأنَّ مُرادَه أنَّ السُّنَّةَ على نوعين: أصليةٌ وفَرْعية، وهذا لم يَقُل به أحد، بل كلُّ ما أمَرَ به رسولُ اللَّه صلَّى اللَّه عليه وسلم فهو حَسَنٌ، وكيف لا يكون من السُّنَن الأصلية، وقد رَوَى جماعةٌ من أهل الحديث أخباراً في ذلك.

وقولُ السَّرُوجي ـ أي الأذانُ بدونِهِ حَسَنٌ ـ أيضاً غيرُ حَسَن، لأنه كيف يكون بدونه حَسَناً وقد أمَرَ به رسولُ اللَّه صلَّى اللَّه عليه وسلم.

وقولُ السَّغْنَاقي: إنَّ الحُسْنَ مذكورٌ في «الظهيرية» كلامٌ وَاهٍ، لأن نسبةَ الحُسْنِ إلى الأذانِ غيرُ مستغرب.

وقولُه: قال الشيخ، كلامٌ واهٍ أيضاً، وكيف يكون هذا نظير ذاك إلا بتأويل بعيد؟!

= «تفسيره» ٤: ٢٢٨، عند تفسيرِ قوله تعالى في سورة النَّحل: ﴿إلاَّ مَن أُكرِه وقَلْبُهُ مطمئنٌ بالإيمان﴾، بسندٍ صحيح عن ابن جريرٍ في «تفسيره» ١٤: ١٨٢.

(١) في «البناية في شرح الهداية» ١: ٥٤٤.

وقولُ صاحب «غاية البيان» خارجٌ عن دائرة التركيبِ بالكلية، ولا مَخْلَصَ ها هنا إلا بأن يقال: تقديرُ التركيب: وإن لم يَفْعَل وَضْعَ إِصْبَعَيْه في أُذُنَيْه، بل وَضَعَهما عليهما فحَسَنٌ ذلك، لأنه قد رَوَى أحمد في حديث أبي مَحْذُورة: «أنه جَعَلَ أصابِعَه الأربعةَ مضمومةً، ووَضَعَها على أُذُنَيْهِ»[1]. فهذا يُزيل الإشكال. انتهى كلامُه.

لا يقال: كيف يكون وَضْعُ الإصبع مستحباً مع أنه قد رَوَى ابن ماجه «أن رسول اللّه صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم أَمَر بلالاً أن يَضَعَ إصبعَيْهِ في أذنيه، وقال: إنه أرفَعُ لصوتك».

ورَوَى الحاكم في «المستدرك» عن عبداللّه بن عَمَّار بن سَعْدِ القَرَظ أَحَدِ مؤذِّني رسولِ اللّه، عن أبيه، عن جده سعد، أن رسول اللّه قال لبلال: «إذا أذَّنتَ فاجعَلْ إصبعَيْك في أُذُنَيْكِ، فإنه أرفعُ لصوتِك».

وقال السَّرُوجي في «شرح الهداية»: رَوَى ابنُ حبان أن رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلم أَمَرَ بلالاً أن يَجعَلَ إِصْبَعَيْه في أُذُنيه. انتهى.

قال العيني: ليس هذا بابن حِبَّان صاحبِ الصحيح، بل هو ابنُ حَيَّان بالياء التحتانية المُثَنَّاة: أبو الشَّيخ الأصبهانيُّ، رواه في كتاب «الأذان».

ورَوَى أبو بكر بن خُزَيمة عن عَوْن، عن أبيه، قال: رأيتُ بلالاً يؤذِّنُ وقد جَعَلَ إِصْبَعَيْه في أُذُنيه. انتهى[2].

فهذا كلُّه يدلُّ على أنَّ رسول الهً صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم

---

(١) أحمد في «المسند» ٣: ٤٠٨. ولم تَرِد في سِياقتِهِ هذه الصِّفَة.

(٢) في «صحيح ابن خزيمة» ١: ٢٠٣ في جماع أبواب الأذان والإقامة (باب إدخال الأصبعين في الأذنين عند الأذان).

أمَرَ بلالاً بذلك، فكيف يكونِ مستحباً؟

لأنا نقول: الْأَمْرُ ها هنا ليس للوجوب بل للاستحباب، والشاهدُ عليه قولُ رسول اللّه صلّى اللّه عليه وسلم «فإنه أرفَعُ لصوتِك» فقد بَيَّنَ حِكمةً في جعْل الإصْبَعَينِ في الْأُذنين، وأشارَ به إلى أنه ليس بضروريّ.

ويدلُّ عليه أيضاً ما ذكره البخاري تعليقاً، ووَصَلَه ابنُ أبـي شيبة في «مصنفه»، وعبدُالرزاق عن ابنِ عمر: أنه كان لا يَجعَلُ إِصْبَعَيْهِ في أُذُنَيهِ في الأذان. ولو كان ضرورياً لجعَلَهُ(١).

وقال صاحبُ «النهاية»، وتاجُ الشريعة، والزيلعيُّ في «شرح الكنز» ومن تَبِعهم: إنما لم يكن وَضْعُهما سُنَّةً لعدمِ ذكرِهِ في حديث الرؤيا، وهو الأصلُ في هذا الباب.

وتَعقَّبهم العينيُّ: بأنه رَوى أبو الشيخ في «كتاب الأذان» عن يزيد بن أبـي زيـاد، عن عبدالـرحمن بن أبـي ليلى، عن عبـدالله بن زَيْـد الأنصاري، قال: «اهتمَّ رسولُ اللّه للأذان، الحديث، وفيه: فقام على سطحِ المسجد، فجعَلَ إِصْبَعَيْه في أُذُنَيهِ وأذَّن، ورأى ذلك عبدُالله بنُ زيد في المنام». ويزيدُ بنُ أبـي زياد متكلَّمٌ فيه. انتهى.

ومُرادُهم من استحباب وضع الإصبعين إدخالُ مُسبِّحَتَيْهِمـا في الأُذنين، لعدم إمكانِ إدخالِ الإصبعين، وكونُ المسبِّحةِ أفضلَ من غيرها، كما ذكره العلامة القُهُسْتَاني وغيرُه.

وهذا الوضعُ أمر مُتوارَث، قال السيوطي في كتاب «الأوائل»: أوَّلُ

---

(١) البخاري ٢: ١١٤ في كتاب الأذان (باب هل يَتتبَّع المؤذن فاه ها هنا وها هنا وهل يلتفت في الأذان؟) وفي مصنف عبدالرزاق ١: ٤٦٦ لم أجده من طريق ابن عمر.

من وَضَع إحدى يديه عِند أُذُنَيْهِ في الأذان ابنُ الأصَمّ مؤذِّنُ الحَجَّاج، وكان المؤذنون قَبْلَ ذلك يضعون أصابعهم في آذانهم. أخرجه سعيد بن منصور وابن أبي شيبة عن ابن سيرين. انتهى.

وثانيها: ما ذكره قاضي خان وصاحب «الخلاصة» من أنه لا يُؤذَّن في المسجد، وغَرَضُهما: أنَّ الأذانَ على موضعٍ عالٍ، منارةً كان أو غيرَها، سُنَّةٌ لرفعِ الصوت، لا في المسجد.

وفي «القُنْيَـة»: يُسنُّ الأذانُ في موضعٍ عالٍ، والإقامةُ على الأرض، وفي أذانِ المغرب اختلافُ المشايخ. انتهى.

قال صاحبُ «البحر»: الظاهرُ أنه يُسنُّ المكانُ العالي في المَغربِ أيضاً. انتهى.

وثالثها: أنَّ المُستحَبَّ للمؤذِّن أن يَستديرَ في صومعتِهِ حيث لم يَبلغ صوتٌ بدونها، وإلا لم تَحصُل لرفعِ الصوتِ فائدة.

وقد جاءت الاستدارةُ مَرْوِيَّةً في أذانِ بلال أيضاً، رواه الترمذي وصَحَّحه.

لا يقال: رَوَى أبو داود عن أبي جُحَيفة قال: أتيتُ رسول الله صلّى الله عليه وسلم بمكة وهو في قُبَّةٍ حمراء من أَدَم الحديث، وفيه: رأيتُ بلالاً خَرَج إلى الأبْطَح فأذَّن، فلمَّا بَلَغ: حَيَّ على الصلاة، حَيَّ على الفلاح، لَوَى عُنُقَه يميناً وشِمالاً ولم يَسْتَدِر» الحديث[1]، فهذا صريح في أنه لم تكن هناك الاستدارة.

---

(١) أبو داود ١: ٣٥٧ في كتاب الصلاة (باب المؤذن يستدير في أذانه). وعبدالرزاق في «مصنفه» ١: ٤٦٧ في كتاب الصلاة (باب استقبال القبلة ووضعه أصبعيه في أذنيه).

لأنا نقول: قد جاءت الاستدارة مرويةً في رواياتٍ أُخَر أخرجها أبو الشيخ والطبراني والدارقطني وغيرُهم، كما بسطها العيني في «شرح الهداية»، والإثباتُ مقدَّمٌ على النفي.

ورابعها: أنه يُكرَهُ أذانُ المرأة، وعلَّله قاضي خان وصاحبُ «المحيط» بأنَّ صوتَها عَوْرَة. وهو تعليلٌ ضعيف، لأن الصحيح أنَّ صوتها ليس بعورة، كما صرَّح به في شرح «المُنْيَة» و«البحر» و«الدُّرّ» وغيرِها.

فالأَولى في تعليله ما أشار إليه صاحبُ «البحر» من أنَّ رفع الصوت في الأذان مندوب، والمرأةُ ممنوعة منه لاحتمالِ الفتنة، ولهذا مُنِعَن من التسبيح، وتعلُّم القرآنِ من الأعمى، وغيرِ ذلك.

ولْيُعْلَم أنَّ المبالغة في الصوتِ مستحَبٌّ في كل كلمة من كلمات الأذان عندنا، إذ لا ترجيعَ فيه خلافاً للشافعية، فإنَّ عندهم يُرفَعُ الصوتُ بالشهادتين، ويُخفَضُ في كلِ أذانٍ إلا الأذانَ الثاني يومَ الجمعة، فإنهم قالوا: إنه لا يُرفَعُ الصوتُ فيه كالأول، لأنه لإعلام الحاضرين كالإقامةِ والأذانِ لِلفائتةِ.

قال في «البحر»: ينبغي أنه لو كان القضاءُ بالجماعةِ يَرفَعُ، وإن كان منفرداً فإن كان في الصحراء يَرفعُ أيضاً، للترغيب الوارد في رفع صوتِ المؤذن، من أنه لا يَسمعُ صوتَه إنسٌ ولا جِنٌّ ولا مَدَرٌ إلا شَهِدَ له يوم القيامة، وإن كان في البيت لا يَرفع، ولم أره في كلام أئمتنا. انتهى وأقرّه في «النهر الفائق».

ومنها: الإقامةُ، فإنه يرفعُ صوتَه بها بحيث يَسمع الحاضرون، ولا يُندَبُ فيه المبالغة كالأذان كما في «التاتارخانية». ولهذا لا يُسَنُّ فيه أن يكون على المَنارة كما في «البحر» عن «القنية».

وهل يُستحبُ فيه وضعُ الإصبعين في الأُذنين؟

حكى الترمذي عن الأوزاعي وغيرِه أنه يُستحبُ فيه أيضاً، وعندنا لا يُستحَبُ ذلك، لكونها أخفضَ، صَرَّح به في «البحر الرائق».

ومنها: التثويبُ، فإنهم صرَّحوا أنه إعلامُ بعد إعلام، فيرفعُ صوته به لتحصُلَ فائدتُه.

ومنها: قراءةُ القرآن، وفيه تفصيل، فإنه لا يخلو إما أن يكون في الصلاة، أو خارجَها، فإن كانت في الصلاة، فإما أن تكون في الفرض أو النفلِ أو الواجب، وعلى كلِ تقديرٍ، فإمَّا أن يكون أداؤه بالجماعة أو منفرداً، ولكل واحدٍ من هذه الصور في (باب جهر القراءة) أحكامٌ على حِدَة.

فأمَّا القراءةُ خارجَ الصلاة فالأحاديثُ جاءت متعارِضةً فيها، فمنها ما يَدلُّ على أفضليةِ الجهر، ومنها ما يدل على أفضليةِ السر، والجَمْعُ بينها على ما ذكره النووي، وتَبِعَهُ من جاء بعده: أنه يَختلِفُ باختلافِ الأحوالِ والأشخاص، فكم من شخصٍ السِّرُّ له أفضل، وكم من شخصٍ الجهرُ له أفضل، مثلاً: من كانت طَوِيَّتُهُ صافيةً عن الرياءِ والعُجْبِ ونحوِ ذلك، ولم يكن هناك من يتأذَّى بقراءته، أو كان هناك مَنْ يَسمعُ بالخُشوع: استُحِبَّ له الجهر، وإلا فلا، وقِسْ عليه، وهكذا ذَكَر جمعٌ من أصحابنا، وعليه المعوَّل.

نعم، لو التزَمَ جَهْرَ سُورةٍ أو نحوِها في موضعٍ مُعَيَّن التزاماً لم يُعهَد في الشرع، وخيفَ منه ظَنُّ العوام لزومَه حتماً كما هو في كثير من التخصيصات الفاشية، فحينئذ لا يخلو عن كراهةٍ ألبَتَّة، ولذا قال في «نِصاب الاحتساب»: قراءةُ الفاتحة بالجماعة جهراً بعدَ الصلاة بدعة.

ونظيرُهُ ما قالوا من أنَّ سجدة الشكر بعد الوتر مكروهةٌ، وإن كانت سجدةُ الشكر في نفسها مُباحةً ومرغوباً إليها، ونظائرهُ كثيرة.

وقالوا: من جَهَر بالقرآن وهناك جماعةٌ يَسمعونه يُستحَبُّ له أن يُخفِيَ آيةَ السجدة، شفقةً على السامعين، فلعلَّ بعضاً منهم لا يكون متوضئاً فيقَعُ في الكراهة، إذ تأخيرُ السجدةَ عن وقتِ وجوبِها مكروه، وكذا في شروح «الهداية».

وفي «الذخيرة» قال محمد في كتاب «الأصل»: لا بأسَ بقراءة القرآن في الحَمَّام، وكَرِهَه النخعي. ولا خلاف في الحقيقة، لأن النخعي إنما كرهه إذا كان يَرفع صوتَه وهناك قومٌ مَشاغيل فلا يَستمعونه، فيكون استخفافاً بالقرآن، وعندنا أيضاً يكره إذا كانت الحالةُ هذه.

وعن هذا كَرِهَ بعضُ مشايخنا التصدُّقَ على السَّائلِ الذي يَقرأ القرآن في السُّوق.

ورأيتُ في فوائد الفقيه أبي جعفر أن قراءة القرآن في الحَمَّام أو المُغْتَسَلِ في موضعٍ يُصَبُّ فيه الماء الذي غُسِلَ به النجاسة مكروهٌ خُفْيَةً كانَتْ أو جهراً.

وفي «الفتاوى»: قراءةُ القرآن في القُبور عند أبي حنيفة تُكرَه، وعند محمد لا تُكرَهُ، قال الصدر الشهيد: وبه أخَذَ مشايخُنا.

وحَكى عن محمد بن الفضل البخاري أنَّ القراءة في المقابر إنما تُكرَهُ إذا جَهَر، وأما إذا أخفَى فلا تُكرَه.

وكان الفقيه أبو اسحاق الحافظ يَحكي عن أستاذه الشيخ أبي بكر محمد بن إبراهيم أنه قال: لا بأسَ بقراءة سُورة المُلْك، أخفَى أو جَهَر، ولم يُفرِّق بين الجهر والخُفية.

ومن المشايخ من قال: خَتْمُ القرآنِ بالجماعة جهراً مكروه. انتهى ملخصاً.

وفي «فتاوى قاضيخان» إنْ قرأ القرآن عند القبور، إن نَوَى بذلك أن يُؤْنِسَهم بصَوْتِ القُرآن[١]، فإنَّهُ يَقْرأ، فإنْ لم يَقصِد ذلك فالله تعالى يَسمع قراءتَهُ حيث كان[٢]. انتهى.

وأما القراءةُ في الصلاة فيَجهر بها في الفجر وأُولَيَيْ المغرب والعشاء أداءً وقضاءً، وجُمعةٍ وعيدينِ وتراويحَ والوترِ في رمضان، وهذا الجهر واجبٌ فمن تركه وجَبَتْ عليه سجدةُ السهو إذا أدَّاها بالجماعة، فإن أدَّاها منفرداً خُيِّر كمتنفِّلٍ بالليل، فإنه مخيَّر بين الجهر والسر، إلا إذا أمَّ فحينئذٍ يَجبُ الجهر، ويُخافِتُ حتماً في الظهر والعصر.

وكذا مَنْ يَقضِي الجهريةَ في وقتِ المُخافَتَةِ منفرداً على ما صَحَّحه صاحبُ «الهداية»، وذكره ابن مَلَك في «شرح المنار» وغيرُه، لكن تعقَّبه غيرُ واحد ورجَّحوا تخييرَه.

والمتنفِّلُ بالنهار يُسِرُّ، فإن جَهَر كُرِهَ تحريماً كما في «البناية»، والمقامُ طويلُ الذيل، لولا خوفُ الإطالة لبسطتُه، وسنبسطه إن شاء الله تعالى في «شَرحِ شَرْحِ الوِقاية».

ورَوَى البخاري ومسلم وأبو داود والنسائي وابن ماجه وغيرُهم عن أبي قَتَادة قال: كان رسول الله صلَّى الله عليه وسلم يَقرأ في الركعتين

---

(١) هكذا في الأصل، وفي «فتاوى قاضي خان» ٣: ٤٢٢ هكذا «أن يُؤنِسَهم صوتُ القرآن».

(٢) في «الفتاوى»: «يَسمعُ قراءة القرآن حيث كانت».

الأولَيين من الظهر بالفاتحةِ وسورة، يُطوِّل في الأولى، ويُقصِّرُ في الثانية، ويُسمِعُ الآيةَ أحياناً»[١].

فيُستنبَطُ من هذا الحديث أنه لو جَهَر بآيةٍ أو آيتين لإسماع المقتدين وتعليمهم لا بأسَ بذلك، ولا يُعَدُّ هذا جهراً في السِّرِّيَّة، وبه صَرَّح بعض أصحابنا أيضاً.

ومما يُلحَقُ به ما في «القُنية» عن شمس الأئمة الحَلْواني: رَأى منكراً فجَهَر بالقراءةِ زَجْراً أو مَنْعاً لا يَضرُّه.

ومنها: تكبيراتُ الصلاة للإمام، وكذا المبلِّغُ يَجهرُ بها بقَدْرِ حاجته للإعلام بالدخولِ والانتقال، وكذا بالتسميع والسلام، وأمَّا المؤتم والمنفرِدُ فيُسمِعُ نفسَه، كذا في «الضياء المعنوي»، لكن لو جَهَر فوق الحاجة فقد أساء كما في «السراج الوهاج».

وفي فتاوى الشيخ محمد بن محمد الغَزِّي: اعلَمْ أنَّ الإمام إذا كبَّر للصلاة فلا بد لصحة صلاته من قَصْدِهِ بالتكبير الإحرام، وإلا فلا صلاة له إذا قَصَدَ به الإعلامَ فقط، فإن جَمَعَ بين الأمرين فذلك هو المطلوب منه شرعاً. انتهى.

قال في «رد المحتار» وَجْهُهُ أنَّ تكبيرةَ الافتتاح شَرْطٌ أو ركن،

---

(١) البخاري ٢: ٢٤٣ في كتاب الأذان (باب القراءة في الظهر). ومسلم ٤: ١٧١ في كتاب الصلاة (باب القراءة في الظهر والعصر). وأبو داود ١: ٥٠٣ في كتاب الصلاة (باب ما جاء في القراءة في الظهر). والنسائي ٢: ١٦٥ في كتاب الافتتاح (تقصير القيام في الركعة الثانية من الظهر). وابن ماجه ١: ٢٧١ في كتاب إقامة الصلاة (باب الجهر بالآية أحياناً في صلاة الظهر والعصر).

فلا بُدَّ في تحققها من قَصْد الاحرام، وأما التسميعُ من الإمام، والتحميدُ من المبلِّغ، وتكبيراتُ الانتقال منهما إذا قَصَد الإعلامَ فقط، فلا فسادَ للصلاة، كذا في «القول البليغ في حكم التبليغ» للسيد أحمد الحَمَوِي، وأقرّه السيد محمد أبو السعود في «حواشي مِسْكين».

والفرقُ: أن قَصْدَ الإعلام غيرُ مفسد، كما لو سَبَّح ليُعلِمَ غيرَه أنه في الصلاة، ولما كان المطلوبُ هو التكبيرَ على قَصْدِ التذكيرِ والإعلام، فإذا مَحَّضَ قصدَ الإعلام فكأنه لم يَذكر، وعدَمُ الذكر في غيرِ التحريمة غيرُ مفسد، وقد أشبعنا الكلامَ على هذه المسألة في رسالتنا: «تنبيه ذوي الأفهام على حكم التبليغ خَلْفَ الإمام». انتهى كلامه.

وفي «فتح القدير»: في «الصحيحين» عن عُبَيدالله بن عبدالله بن عُتْبَة بن مسعود قال: «دخلتُ على عائشة فقلتُ: ألا تُحدِّثيني عن مَرَضِ رسول الله؟ فقالت: بلى لما ثَقُلَ رسول الله صلّى الله عليه وسلم قال: أصلَّى الناسُ؟ قلنا: لا، هم ينتظرونك، قال: ضَعُوا لي ماءً، ففعلوا، فاغتَسَل، ثم ذَهَب لِيَنُوءَ فأُغمِيَ عليه[١]، ثم أفاق، فقال: أصلَّى الناس؟ قلنا: لا، والناسُ عكوف ينتظرون للعِشاءِ الآخِرة، فأرسَل رسولُ الله صلّى الله عليه وسلم إلى أبي بكر أن يُصلِّي بهم، فصَلَّى بهم أبو بكر.

ثم إنَّ رسول الله صلّى الله عليه وسلم وَجَد خِفَّةً في نفسه، فخَرَج يُهادَى بين رجلين، أحدُهما العباس، لصلاةِ الظهر، وأبو بكر يُصلِّي بالناس، فلما رآهُ ذَهَب ليتأخر، فأشار رسولُ الله له أن لا يَتأخَّر، وقال

---

(١) لينوءَ، أي لِيَنْهَض بجهد.

لهما: أَجْلِساني إلى جَنْبِهِ، فكان أبـو بكر وهـو قائم يُصلِّي بصـلاةِ رسول اللَّه صلّى اللَّه عليه وسلم، والناسُ يصلون بصلاةِ أبـي بكر، والنبـيُّ صلى اللَّه عليه وعلى آله وسلم قاعد»[١].

وما رَوَى الترمذي عن عائشة قالت: «صلّى رسول اللَّه صلّى اللَّه عليه وسلم في مَرَضه الذي تُوفِّي فيه خَلْفَ أبـي بكر قاعداً» وقال: حسن صحيح[٢].

وأخرج النسائي عن أنس قال: «آخِرُ صلاةٍ صلاَّها رسول اللَّه صلّى اللَّه عليه وسلم مع القَوْم في ثوبٍ واحد مُتَوَشِّحاً خَلْف أبـي بكر»[٣].

فأولاً: لا يُعارِضُ ما في «الصحيحين».

وثانياً: قال البيهقي: لا تَعارُضَ، فالصلاةُ التي كان إماماً فيها صلاةُ الظهر يومَ السبتِ أو الأحد، والتي كان مأموماً فيها صلاةُ الصبح يوم الاثنين، وهي آخِرُ صلاة صلاها حتى خَرَج من الدنيا.

قال الأعمش: في قولها: والناسُ يصلون بصلاة أبـي بكر، تَعنِي: أنه كان يُسمِعُ الناسَ تكبيرَهُ صلّى اللَّه عليه وعلى آله وسلم.

وفي «الدارية»: وبه يُعرَفُ جـوازُ رفع المؤذِّنين أصـواتَهم في الجمعةِ والعيدين وغيرِهما.

---

(١) البخاري ٢: ١٧٢ في كتاب الأذان (باب إنما جُعِلَ الإمامُ ليؤتَمَّ به)، ومسلم ٤: ١٣٥ في كتاب الصلاة (باب استخلاف الإمام إذا عَرَض له عُذْر).

(٢) الترمذي ٢: ١٩٦ في كتاب الصلاة (باب ما جاء إذا صلى الإمام قاعداً فصلوا قعوداً).

(٣) النسائي ٢: ٧٩ في كتاب الإمامة (باب صلاة الإمام خلف رجل من رعيته).

أقول: ليس مقصودُه خصوصَ الرفع الكائن في زماننا، بل أصلَ الرفع لإبلاغِ الانتقالات.

أما خصوصُ هذا الذي تعارفوه في هذه البلاد، فلا يَبعُدُ أنه مُفْسِدٌ غالباً، لأنه يَشتَمِلُ على مَدِّ همزةِ (اللّه)، أو (أكبَر)، أو بائِه، وذلك مُفسد، ولأنهم يبالغون في الصياح زيادةً على حاجة الإبلاغ، والاشتغالُ بتحريراتِ النَّغَم إظهاراً للصناعةِ النَّغَمِيَّة مُلْحَقٌ بالكلامِ والصِّياح.

وسيأتي في (باب ما يُفسد الصلاة)[١]: أنه إذا ارتفع بكاؤه من ذكرِ الجنة والنار لا يُفسِد، ولو لمصيبةٍ يُفسِد، لأنه في الأول تعرَّض لسؤالِ الجنةِ والتعوُّذِ من النار، وفي الثاني لإظهارِ المصيبة، ولو صَرَّح به فقال: وامُصِيبتاهُ! أو أدركوني! فَسَد، فهو بمنزلتِهِ، وهنا معلوم أنَّ قَصْدَه إعجابُ الناس به، ولو قال اَعْجَبُوا من حُسْنِ صوتي وتحريري فَسَدَتْ صلاته، وحُصولُ الحرف لازمٌ من التلحين، ولا أرى ذلك يَصْدُرُ ممَّن يَفْهَمُ معنى الدعاءِ والسؤالِ، وما ذلك إلا نوعُ لَعِب. انتهى ملخصاً[٢].

وأقرَّه على ذلك صاحب «البحر»، وصاحبُ «الدُّرّ المختار»، وحسَّنَه صاحبُ «الحِلية».

وتعقبه السيد أحمد الحَمَوي في «القول البليغ» بأنه صَرَّح في «السِّراج» أن الإمام إذا جَهَر فوقَ الحاجة فقد أساء، والإساءَةُ دون الكراهة، ولا تُوجِبُ الإفساد.

وقياسُهُ على البكاء غيرُ ظاهر، لأن هذا ذكرٌ بصيغة، فلا يتغير بعزيمة، والمفسِدُ للصلاة الملفوظُ لا غَمْغَمَةُ القلب. على أن القياس بعدَ

---

(١) يعني في كتاب «فتح القدير» المنقول منه.

(٢) أي كلامُ صاحب كتابِ «فتح القدير» الكمالِ بن الهُمَام ١: ٢٦١ ـ ٢٦٣.

أربع مِئة منقطعٌ، فليس لأحد بعدَها أن يقيسَ مسألةً على مسألة، كما ذكره ابنُ نُجَيم في رسائله. انتهى.

وأجاب عنه ابنُ عابدين في رسالته «تنبيه الأفهام على حُكْم التبليغ خَلْفَ الإمام» وغيرِه من تصانيفه: بأنَّ الكَمالَ(١) لم يَجعل الفسادَ مَبْنِياً على مُجرَّد الرفع، حتى يَرِدَ عليه ما في «السراج»، بل بَنَاه على زيادةِ الرفع الملحقةِ بالصِّياح.

وقولُ الحَمَوي: وقياسُهُ على البكاء الخ كلامٌ ساقط، لأن ما ذكره قولُ أبي يوسف، حيث بَنَى عليه عدَمَ الفساد فيما لو فَتَح المصلِّي على غيرِ إمامِه، أو أجاب المؤذِّن، أو أُخْبِرَ بما يَسرُّه، فقال الحمدُ للَّه، أو نحوِ ذلك.

والمذهبُ: الفسادُ في الكل، وهو قولُهما، لأنه تعليمٌ، وتعلُّمٌ، وخطابٌ، وجوابٌ.

وكونُ الذكر غيرَ متغيرٍ بعزيمةٍ ممنوع، ألا ترى أنَّ الجنب إذا قرأ ﴿الحمدُ للَّه رب العالمين﴾ على عَزْم الشكر والثناءِ جاز.

وحيث كان مَناطُ الفساد عندَهما كونَ اللفظ أُفِيدَ به معنًى ليس من أعمال الصلاة، كان ذلك قاعدةً كلية تندرجُ تحتها أفرادٌ جُزئية، منها مسألتُنَا هذه، إذ لا شك أنه إذا لم يَقصِد الذكر بل بالَغَ في الصياح لأجل تحرير النغمِ والإعجابِ، يكونُ قد أفاد به معنى ليس من أعمال الصلاة.

وليس هذا من القياس المنقطع، بل هو تصريحٌ بما تضمَّنه كلامُ المجتهد، أو دَلَّ عليه دلالةَ المساواة

---

(١) يعني: الكمال بن الهُمَام صاحب «فتح القدير».

ومنها: الخُطبة سواء كانت خُطبةَ الجمعة، أو خُطبةَ العيدين، أو خِطبةَ النكاح، أو غيرَ ذلك.

فالخطيبُ يَجهَرُ بها على ما هو المتوارَث، ودَلَّ عليه قولُه تعالى ﴿فاسْعَوْا إلى ذكرِ اللّه، وذَرُوا البيع﴾[١]، وشَهِدَتْ له أحاديثُ قولية وفعلية، لكن يَجهر بالثانية أقلَّ من الأولى كما في «الدر المختار».

ومنها: تكبيراتُ التشريق، يَجهَرُ بها الإمامُ ومَنْ خَلْفَهُ من الرجال، والمرأةُ تُخافِتُ، من فَجْرِ عَرَفة إلى عصرِ يوم النحر، أو إلى آخر أيام التشريق، على اختلافِ القولين.

والمختارُ هو الأخير لما رَوَى ابنُ أبي الدنيا عن جابر بن عبداللّه قال: «كان رسول اللّه صلّى اللّه عليه وعلى آله وسلم إذا صلّى صلاةَ الغَداةِ من عَرَفَة حَنى أعلى رُكبتَيْهِ وقال: اللّه أكبر، اللّه أكبر، لا إله إلا اللّه، واللّه أكبر، اللّه أكبرُ ولِلّهِ الحمد، إلى عصرِ آخِرِ أيام التشريق».

وروى ابن أبي شيبة وابن أبي الدنيا والمَرْوَزِي في كتاب العيدين، والحاكم عن عُبَيد بن عمير قال: «كان عمر رضي اللّه عنه يكبِّرُ بعد صلاة الفجر من عرفة إلى صلاةِ الظهر أو العصر من أيام التشريق»[٢].

ورَوَى ابن أبي شيبة وابن أبي الدنيا والحاكم عن عُمَير بن سعد قال: «قَدِم علينا ابنُ مسعود فكان يكبِّرُ من صلاةِ الصُّبح من يومِ عَرَفة إلى العصر من آخِرِ أيام التشريق»[٣].

---

(١) من سورة الجمعة، الآية ٩.

(٢) الحاكم في «المستدرك» ١ : ٢٩٩ في كتاب العيدين، بسند صحيح.

(٣) الحاكم ١ : ٣٠٠ في كتاب العيدين.

ورَوَى ابن أبـي شيبة والحاكم عن شقيق قال: «كان علي رضي الله عنه يكبِّرُ بعدَ الفجر من عرفة، ثم لا يَقطَعُ حتى يُصلِّي العصرَ في آخرِ أيامِ التشريق»(١).

ورَوَى ابن أبـي شيبة والمروزي والحاكم نحوَه عن ابن عباس رضي الله عنهما.

وبهذا ظَهَر ضَعْفُ ما استَدلَّ به صاحبُ «الهداية» على مذهب أبـي حنيفة، من أن الجهرَ بالتكبير بِدْعة.

فالأَخْذُ بالأقلِّ أولى، وذلك لأنه لا معنى لكونه بدعة بَعْدَ ورودِ هذه الآثار، الدالَّةِ على شرعيةِ الجهر إلى آخر أيام التشريق.

وقد فسَّر أهلُ التفسير قـوله تعـالى: ﴿واذكُرُوا اللَّهَ في أيـامٍ معدودات﴾(٢)، بهذا التكبير.

والأخذُ بالأكثـر في بابِ العبـادات أولى للاحتيـاط، لا بالأقـلِّ كما لا يخفى.

وكذا يَجهر بالتكبير في طريقِ صلاة عيدِ الأضحى اتفاقاً، لورود الأثرِ بذلك.

وأما الجهرُ بالتكبير في الأسواقِ في الأيام العَشْر، فقال بعضُ

---

(١) الحاكم ١: ٢٩٩ في كتاب العيدين. وقال الحاكم: «فأما مِن فِعل عمر وعلي وعبدالله بن عباس وعبدالله بن مَسْعُود فصحيحٌ عنهم التكبير من غداة عرفة إلى آخر أيام التشريق»، ثم ساق ذلك بالأسانيد عنهم، وقد أورد المؤلِّفُ ذلك عنهم رضي الله عنهم.

(٢) من سورة البقرة: الآية ٢٠٣.

أصحابنا: إنه ليس بشيء، وقال بعضهم: إنه حَسَنٌ لورودِ الأثر في ذلك عن ابن عمر رضي اللَّه عنهما وغيرِه.

وفي «جامع التفاريق» قيل لأبي حنيفة: أينبغي لأهلِ الكوفة أن يُكبِّروا أيامَ التشريق في الأسواقِ والمساجد؟ قال: نعم.

وقال الفقيه أبو اللَّيث: كان إبراهيمُ بن يوسف يُفتي بالتكبير في الأسواق في الأيامِ العَشْر.

وقال أبو جعفر الهِنْدُواني: عندي أنه لا يَنبغي أن يُمنَعَ العامَّةُ من ذلك، لِقلَّةِ رغبتهم في الخير، وبه نأخذ كذا في «البناية».

وهل يَجهر بالتكبير في طريقِ عيدِ الفطر أم لا؟

فعندهما: نعم، وعند أبي حنيفة، لا، لأنَّ الأصل في الأذكار الإخفاءُ، إلا فيما وَرَد الشرعُ به.

هكذا حَكَى الخلافَ في «البدائع» و«السِّراج الوهَّاج» و«دُرَر البحار» و«ملتَقى الأبْحُر» و«الدُّرَر» و«الاختيار» و«مَواهب الرحمن» و«التاتَرْخَانية» و«التَجْنِيس» و«مُختَارات النوازل» و«الكفاية» و«المِعراج» و«زاد الفقهاء» و«غاية البيان» و«البِناية»، وغيرِها من الكتب المعتمدة.

وفي حواشي «مَراقي الفلاح» للطَّحْطَاوي: قال الحَلَبي: الذي ينبغي: أن يكونَ الخلافُ في استحبابِ الجهرِ وعَدَمِه، لا في كراهتِهِ وعَدَمِها، لأنَّ الجهرَ قد نُقِلَ عن كثير من السَّلف، كابنِ عمر وعلي وأبي أُمامة والنخعي وعمر بن عبدالعزيز وابن أبي ليلى والحَكَم وحَمَّاد ومالك والشافعي وأحمد وأبي ثَوْر، كما ذكره ابنُ المنذر في «الإشْرَاف». انتهى.

وقال في «الخلاصة»: لا يُكبِّرُ يومَ الفِطر، وعندهما يُكبِّر ويُخافِتُ، وهو إحدى الروايتين عنه، والأصحُّ ما ذكرنا أنه لا يُكبِّرُ. انتهى.

فأفاد أنَّ الخلاف في أصلِ التكبير، لا في صِفَتِهِ، وأنَّ عَدَمَ الجهر متفقٌ عليه.

ورَدَّه ابنُ الهُمَام بأنه ليس بشيء، إذ لا يُمنَعُ من ذكرِ الله تعالى في وقتٍ من الأوقات، بل من إيقاعِهِ على وجهِ البدعة.

وتَبِعَه ابنُ أمير حاج حيث قال في «حِلية المحلي»[1]: اختُلِفَ في عيد الفطر، فعنه وهو قولُ صاحِبَيْهِ وهو اختيارُ الطحاوي: أنه يَجهَرُ، وعنه أنه يُسِرّ.

وأغرَبَ صاحبُ «النِّصاب» في قوله: يُكبِّر في العيدين سِراً، كما أغرب من عَزَى إلى أبي حنيفة أنه لا يُكبِّر في الفطر أصلاً، وزَعَم أنه الأصحُّ كما هو ظاهر «الخلاصة». انتهى.

ومنها: التَّلْبِيَةُ، فالمُحْرِمُ يَجهَرُ بها، لما رواه أبو داود والنسائي والترمذي وصحَّحه وابنُ ماجه وأحمد بن حنبل وابن خزيمة والحاكم[2]

---

(١) هكذا وقع هنا أيضاً كما وقع قبلاً في ص ٢١، وذكرتُ هناك أن الصواب فيه «حَلْبَة المُجَلِّي»...، فعُدْ إليه.

(٢) الحاكم ١: ٤٥٠ في كتاب المناسك وأبو داود ٢: ٤٠٥ في كتاب المناسك (باب كيف التلبية) والترمذي ٣: ١٩١ في كتاب الحج (باب ما جاء في رفع الصوت بالتلبية). وقال حسن صحيح. والنسائي ٥: ١٦٢ في كتاب مناسك الحج (رفع الصوت بالإهلال). وابن ماجه ٢: ٩٧٥ في كتاب المناسك (باب رفع الصوت بالتلبية). وابن خزيمة ٤: ١٧٣ في كتاب المناسك (باب إباحة الزيادة في التلبية). والإمام أحمد ٤: ٥٥.

وصحَّحه عن خَلَّاد بن السائب، عن أبيه مرفوعاً: «أتاني جبريل فأمَرَني أن آمُرَ أصحابي أن يَرفعوا أصواتَهم بالتلبيةِ والإهلال، فإنها من شعائر الحج»، ورواه مالك والشافعي وابنُ أبي شيبة أيضاً.

ورَوَى ابن ماجه وابن خزيمة وابن أبي شيبة وابن حبان والحاكم وصحَّحه عن زيد بن خالد الجُهَني مرفوعاً: «جاءني جبريلُ فقال: مُرْ أصحابَك، فلْيَرفعوا أصواتَهم بالتلبية، فإنها من شِعَار الحج»[1].

والجهرُ بالتلبية أمْرٌ مُتوارَث من العهد النبوي إلى زماننا هذا من غيرِ نكير.

وفي «الهداية» يَرفَعُ صوتَهُ بالتلبية لقوله عليه السلام: «أفضَلُ الحجِّ: العَجُّ والثَّجُّ»[2]، فالعَجُّ رفعُ الصوت بالتلبية، والثَّجُّ: إسالَةُ الدم. انتهى.

قال في «فتح القدير»: اعلم أنَّ رفع الصوت سُنَّة، فإن تَرَكَهُ كان مسيئاً، ولا شيءَ عليه، ولا يُبالِغُ به فيُجهِدُ نفسَه كيلا يَتضرَّر، ولا منافاةَ بين قولنا: أن لا يُجهِدَ نفسَه، وبين الأدلةِ الدالةِ على رفع الصوتِ بشدة، كما هو معنى العَجّ، إذْ لا تلازُمَ بين ذلك وبين الإجهاد، إذ قد يكون

---

(١) الحاكم ١ : ٤٥٠ في كتاب المناسك. وابن ماجه ٢ : ٩٧٥ في كتاب المناسك (باب رفع الصوت بالتلبية). وابن خزيمة ٤ : ١٧٤ في كتاب المناسك (باب البيان أن رفع الصوت بالإهلال من شعار الحج).

(٢) الحاكم ١ : ٤٥١ من حديث أبي بكر في كتاب المناسك ولفظه (سُئل أيُّ العمل أفضل...) وقال الذهبي: صحيح. والترمذي ٣ : ١٨٩ في كتاب الحج (باب ما جاء في فضل التلبية والنحر). من حديث أبي بكر. وابن ماجه ٢ : ٩٧٥ في كتاب المناسك (باب رفع الصوت بالتلبية).

الرجلُ جَهْوَرِيَّ الصوتِ، فيَحْصُلُ الرفعُ العالي مع عدم تَعَبه به. انتهى.

ومنها: الجهرُ بالسَّلامِ على الناس، وجوابِهِ، فلو أَسرَّ به بحيث لم يَسمعه غيرُه لم يُؤدِّ السُّنَّة.

وكذا السلامُ على الأموات، ينبغي أن يَجهرَ بحيث يَبلُغُ إلى سَمْعِه لتُجِيب، كما وَرَد في الأحاديث.

ومنها: جوابُ العاطس، قال في «الخانية»: شَرْطٌ في رَدِّ السلام وجوابِ العُطاس: إسماعُه، فلو لم ـ يُسمِعْه ـ يُرِيه تحريكَ شَفَتَيْه. انتهى.

ومنها: ما قال في «القنية»: التكبيرُ جهراً لا يُسنُّ في غيرِ أيام التشريق إلا بإزاء العَدُوِّ واللصوص، وقاسَ عليه بعضُهم الحريقَ والمَخاوِفَ كلَّها، وهكذا في «البناية» وغيرِهما.

ومنها: الجهرُ بالتسبيح بعدَ الفراغ من الوِتْر، لما وَرَد به الحديثُ كما مَرّ[1].

تتمة: يُكرَهُ رفعُ الصوت بالذكر والقراءة لحاملي الجنازةِ ومَنْ معهم تحريماً، وقيل تنزيهاً، وينبغي أن يُطِيلوا الصمت، ولو أرادوا الذكرَ ذكروا في أنفسهم، كذا في «فتح القدير» وغيرِه.

قال في «رد المحتار»: وإذا كان هذا في الدُّعاءِ والذكرِ فما ظَنُّك بالغِناءِ الحادِثِ في هذا الزمان؟! انتهى.

---

(١) في ص ٦٦.

وفي «الجواهر النفيسة شرح الدُّرَّة المُنِيفة»: لا يَرفَعُ صَوْتَه بالذكر، أي يُكرَهُ رَفْعُ الصوتِ بالذكرِ والقراءةِ والتكبيرِ خَلْفَ الجنازة. انتهى.

هذا آخِرُ الكلام في هذا المَرام، والحمدُ لذي الجلال والإكرام، والصلاةُ على سيد الأنام وآلِهِ وصحبِهِ الكرام.

وكان اختتامه في يوم الخميس الثامن والعشرين من ربيع الثاني[1] من شهورِ سَنَةِ سَبْعٍ وثمانين بعدَ الألف والمِئتين من الهجرة النبوية، على صاحبها أفضلُ الصلاةِ والتحيَّة.

قال العبد الضعيف الفقير إلى الله تعالى عبدالفتاح ابن محمد أبو غدة ـ عفا الله عنه ـ: فَرغتُ منه قراءةً وضبطاً وتهيئةً للطبع في مدينة كراتشي في باكستان صباحَ يوم الأربعاء ٢٨ من ذي الحجة سنة ١٤٠٤، ثم نظرتُ فيه مرةً أخرى وعلَّقتُ عليه ما تيسَّر، وفرغتُ منه بعدَ المغرب من يوم الجمعة ١٥ من جمادى الآخرة سنة ١٤٠٧ في مدينة الرياض، والحمد لله رب العالمين.

* * *

---

(١) الأسلوب العربي الصحيح: من ربيعٍ الآخِر. ولم تَقُل العربُ (الثاني).

المحتـــوى

١ ـ الآيات القرآنية

مرتبةً كما وَرَدَ ذكرُها في الكتاب

* * *

٢ ــ الأحاديث النبوية

مرتبةً على أوائل أطرافها الواردة بها

* * *

٣ ــ الآثار الموقوفة

الصفحة

* * *

٤ ـ أسماء رواة الأحاديث ومواضع ما رَوَوْا

* * *

٥ ـ الموضوعات[١]

الصفحة

---

(١) وما خُتِمَ منها بحرف (ت)، فمعناه أن المضمون قبلَه جاء في التعليق

مقدمة المؤلف للكتاب

مقدمة في حَدِّ الجَهْر والسِّر

أدلة جواز الجهر بالذكر

* * *

محبتِ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو سے معطر
علمی و تحقیقی تصانیف
از مفتی محمد خان قادری
نائب امیر عالمی دعوتِ اسلامیہ